آدمی کا مقدّر



قرۃ العین حیدر

اقبال خالد

آدمی کا مقدر

مکتبۂ پاکستان
۱- انار کلی، لاہور-۲

قرۃ العین حیدر کی دیگر کتب

۱- کارِ جہاں دراز ہے
۲- آگ کا دریا
۳- جہانِ دیگر
۴- سیتا ہرن
۵- ماں کی کھیتی
۶- گلگشت
۷- کوہ دماوند
۸- فصلِ گل آئی یا اجل آئی
۹- آلپس کے گیت
۱۰- ڈِنگو
۱۱- جہاں پھول کھلتے ہیں
۱۲- جگنوؤں کی دنیا
۱۳- ہمیں چراغ ہمیں پروانے
۱۴- تلاش
۱۵- پت جھڑ کی آواز
۱۶- تین ناولٹ

آدمی کا مقدر

مائیخل شولوخوف

قرۃ العین حیدر

مکتبہ اردو ادب

بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ ، لاہور

آدمی کا مقدر

مائیخل شولوخوف

قرۃ العین حیدر

مکتبہ اُردو ادب
بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ ، لاہور

ناشر .... سرفراز احمد

مطبع .... زاہد بشیر پرنٹرز لاہور

[redacted] .... -/[redacted]

ترتیب

آدمی کا مقدر

دریائے ڈون کے اوپری علاقے میں جنگ کے بعد پہلی بار جو بہار آئی اس میں بڑی انوکھی، دلوانگیز اور جتول ساماں کیفیت تھی۔ مارچ کے اواخر میں ازرق سمندر کے ساحلوں سے گرم ہوائیں چلیں اور ڈون کے اندر اندر دریا کا ریتیلا کنارہ بس اجڑ کے رہ گیا۔ چراگاہوں کی برف پوش گھاٹیاں جھیلیں بن گئیں، اور نالے امنڈ پڑے۔ ندیوں پر برف پڑی اور جل تھل ایک ہوئے۔ سڑکوں پر آمد و رفت ناممکن ہو گئی۔

اس ناسازگار موسم میں اتفاق سے مجھے بوکنووسکایہ کے گاؤں جانا پڑا۔ فاصلہ تقریباً ۶۰ کلومیٹر سے زیادہ نہ تھا، لیکن سفر بہت کٹھن ثابت ہوا۔ میں اور میرا دوست سورج نکلنے سے پہلے ہی روانہ ہو گئے۔ سڑک کی کیچڑ کی وجہ سے ہمارے تر و تازہ گھوڑے بڑی دقت سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کی رانیں تن گئی تھیں، اور گاڑی ان سے کھینچے نہ کھنچتی تھی۔ پہیے دھروں تک ریتلی کیچڑ اور برف

میں دھنس گئے اور گھنٹے بھر میں جھاگ کے سفید سفید ملائی جیسے بلبلے بے چارے گھوڑوں کے پہلوؤں، رانوں اور نسموں پر نمودار ہو گئے۔ تارکول سے لپی ہوئی کاٹھی کی بو اور پسینے کی نشہ آور مہک صبح کی تازہ ہوا میں رچ گئی۔

جب گھوڑوں کے لیے آگے بڑھنا ناممکن ہو گیا تو ہم لوگ اتر کر پیدل چلنے لگے۔ برفیلی کیچڑ ہمارے بوٹوں کے نیچے کچر کچر کرتی۔ اس میں سے گذرنا بھی آسان نہ تھا۔ سڑک کے کنارے کنارے ابھی تک چمکیلی اور سخت برف کی سطحیں موجود تھیں اور ان پر چلنا اور زیادہ مشکل تھا۔ ایلانکا ندی تک پہنچنے کیلئے تیس کلومیٹر کا فاصلہ ہم نے پورے چھ گھنٹے میں طے کیا۔

موخود سکری کے گاؤں کی ننھی سی ندی جو گرمیوں بھر خشک رہتی تھی، اب بید کے درختوں تک ڈھکی ہوئی دلدل تک پھیل چکی تھی۔ ایک سپاٹ تہہ والی چھیدیلی ڈونگی میں ہم کو ندی عبور کرنا تھی۔ گھوڑے کھول دیے۔ دوسرے کنارے پر ایک اجتماعی فارم کے سائبان میں ایک پرانی دھرانی جیپ (جو جاڑوں بھر زیادہ تر وہیں کھڑی رہی تھی) ہماری منتظر تھی۔ میں اور ڈرائیور دونوں ذرا تذبذب کے ساتھ اس ہلتی ڈولتی ناؤ پر سوار ہو گئے۔ میرا ساتھی سامان کے ساتھ کنارے پر ٹھہر رہا۔ ہم نے ابھی چپو اٹھائے ہی تھے کہ ڈونگی کے بوسیدہ تختوں میں سے پانی کے ننھے ننھے فوارے ابل پڑے۔ ہم نے جوں توں کر کے ان سوراخوں کو بند کیا، اور پانی الیچتے الیچتے گھنٹہ بھر

میں ندی کے دوسرے ساحل تک جا پہنچے۔ ڈرائیور گاؤں سے جیپ لے کر آیا، اور پھر ڈونگی میں جا بیٹھا۔ "اگر یہ کھیل کشتی میں پہنچ کر کھیل نہ ہو گئی۔" چپو اٹھاتے ہوئے اس نے کہا: "تو میں تمہارے دوست کو دو گھنٹے کے اندر اندر لے آؤں گا۔"

گاؤں دریا سے کافی دور تھا اور دریا پر اس قسم کی خاموشی چھائی ہوئی تھی جو وسط خزاں یا موسم گل کی آمد کے وقت ویرانوں پر طاری ہوتی ہے۔

بید کے گلتے ہوئے درختوں کی مہک کی وجہ سے دریائی ہوا نم اور تلخ تھی۔ لیکن ہلکے ہلکے جھونکے دور ارغوانی دھندلکوں میں نہائی ہوئی چراگاہوں سے اس دھرتی کی ابدی جوان اور مدھم خوشبو اپنے ساتھ لا رہے تھے جو برف کی قید سے ابھی ابھی آزاد ہوئی تھی۔

کچھ فاصلے پر بانس کا ایک شکستہ جنگلہ ساحل کی ریت پر پڑا تھا۔ میں سگریٹ پینے کے لیے اس پر جا بیٹھا۔ جب میں نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو پتہ چلا کہ سگریٹ کی ڈبیہ بھیگ چکی ہے۔ ایک اونچی لہر نے کشتی پر اچھل کر مجھے کمر کمر گدلے پانی میں شرابور کر دیا تھا اور سگریٹ کو بچانے کی فکر کرنے کے بجائے مجھے چپو چھوڑ کر جلد از جلد پانی الیچنا پڑا تھا، مگر اب مجھے اپنی بے پروائی پر بڑی جھنجلاہٹ محسوس ہوئی۔ میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا، اور گیلے اور بھورے سگریٹوں کو ایک قطار میں جنگلے پر رکھنا شروع کر دیا۔

دوپہر ہو چکی تھی۔ آفتاب ماہ مئی کی تمازت کے ساتھ چمک رہا تھا۔ مجھے امید تھی، کہ سگریٹ جلد خشک ہو جائیں گے۔ گرمی کی شدت کی وجہ سے میں پچھتانے لگا کہ نا حق روئی دار فوجی پتلون اور دگلہ پہن کر آیا

آج کا دن سال کا پہلا گرم دن تھا۔ لیکن اپنا پرانا فوجی لبادہ اتار کے، کشتی رانی کی محنت کے بعد ہوا میں بال خشک کرتے ہوئے اور آسمان پر سے گذرتے دبیز بادلوں کو کاہلی سے دیکھتے ہوئے خود کو مکمل طور پر سکوت اور تنہائی کے سپرد کر کے وہاں اکیلا بیٹھنا مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔

اتنے میں گاؤں کے آخری گھروں کے پیچھے سے نکل کر ایک آدمی آتا دکھائی دیا۔ وہ ایک پانچ چھ سالہ لڑکے کے آگے آگے چل رہا تھا۔ دونوں تھکے ہارے قدم اٹھاتے ہوئے ندی میں پایاب اترنے والے گھاٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ لیکن جیپ کے قریب پہنچنے کے بعد وہ دونوں مڑ کر میری جانب آئے۔ آدمی طویل القامت تھا۔ اور ذرا سا جھک کر چل رہا تھا۔ اس نے بالکل میرے نزدیک پہنچ کر گہری، بھاری آواز میں کہا :

"ہلو بھائی ۔۔۔۔۔"

"ہیلو ۔۔۔" میں نے اس کا بڑا اور کھردرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر مصافحہ کیا۔

وہ لڑکے کی طرف جھک کر بولا۔

یہ چچا کو بلو کہو بیٹا۔ شاید یہ بھی تمہارے ابا کی طرح ڈرائیور ہیں، ہم اور تم لاری چلایا کرتے تھے کہ نہیں یہ حضرت وہ سامنے والا چھکڑا چلاتے ہیں،"

آسمان کی مانند روشن اور شفاف آنکھیں اٹھا کر ذرا سا مسکراتے ہوئے بچے نے بڑی خود اعتمادی سے ایک ننّا سا گلابی ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں نے ملائمت سے مصافحہ کیا۔ "سردی لگ رہی ہے بڑے میاں؟ اتنی گرمی میں تمہارا ہاتھ اتنا ٹھنڈا کیوں ہے؟"

ایک بجیدول آویز معصوم بھروسے کے ساتھ بچہ میرے گھٹنوں سے لگ گیا۔ اور اپنی سنہری بھنوئیں تعجب سے اونچی کیں۔

"میں بڑے میاں تھوڑا ہی ہوں چچا، میں تو ایک چھوٹا سا لڑکا ہوں اور مجھے سردی تھوڑا ہی لگ رہی ہے، میرے ہاتھ اس لیے ٹھنڈے ہیں کہ میں برف کے گولے بنا رہا تھا"

آدھا بھرا ہوا تھیلا کندھے سے اتار کر اس کا باپ بھاری بھر کم پن سے میرے پہلو میں بیٹھ گیا۔

"اس ننھے راہی نے میری جان آفت میں کر رکھی ہے، مجھے بھی تھکاتا ہے اور خود بھی تھکتا ہے، اگر میں لمبے ڈگ بھرتا ہوں، تو یہ سمجھو دلکی چلنے لگے گا، تم ذرا اس پیادے سپاہی کے ساتھ چل کر دیکھو! مجھے ایک قدم اٹھانے کے بجائے تین تین قدم پھلانگنے پڑتے ہیں اور ہم دونوں گھوڑے

اور کھوپڑی کی دوڑ میں لگے رہتے ہیں اور صاحبزادے کی حرکتوں پر نظر رکھنے کے لیے کھوپڑی کے پیچھے بھی آنکھیں چاہئیں۔ میری پیٹھ مڑی نہیں اور اس نے کسی مٹھائی میں چھپ چھپ کرنا شروع کیا۔ یا برف کا جما قطرہ توڑ کر اسے مٹھائی کی طرح چوسنے لگا۔ کبھی کچھ، کبھی کچھ، نہیں صاحب، اس جیسے ہمراہی کے ساتھ سفر کرنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔" کچھ دیر سفر کرنے کے بعد اس نے پوچھا۔

"اور تم سناؤ استاد! اپنے چیف کا انتظار کر رہے ہو؟"

اس وقت یکلخت میں اسے یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں ڈرائیور نہیں ہوں۔ میں نے کہا۔

"لگتا ہے، ابھی مجھے ذرا اور راہ دیکھنا پڑے گی۔"

"دوسرے کنارے سے آرہا ہے تمہارا چیف؟"

"ہاں۔"

"کشتی ابھی آنے والی ہے؟"

"دو گھنٹے لگیں گے۔"

"لمبا نسخہ ہے! خیر، آرام سے بیٹھو، مجھے بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔ ابھی تم پر نظر پڑی تو سوچا اسی ڈرائیور برادری کا آدمی ہے۔ ذرا بیٹھا دھوپ سینک رہا ہے۔ اس کے پاس چل کر سگریٹ کے ایک دو کش

لگا لیے جائیں۔ تنہا مرنے کی طرح اکیلے اکیلے تمباکو پینے میں بھی مزہ نہیں۔ تم لگتا ہے خوب کما رہے ہو، سگریٹ پیتے ہو؟ بھیگ گئے؟ بھیگا سگریٹ بیمار گھوڑے کی طرح بالکل بیکار ہے۔ میرے اس موٹے تمباکو کا ایک دم لگا کر دیکھو۔"

اس نے خاکی پتلون میں سے ایک گھسا ہوا ریشمی بٹوا نکال کر کھولا، مجھے بٹوے کے کونے پر یہ الفاظ دکھائی دیئے۔

"ہمارے محبوب سپاہی کے لیے،

لبیڈیانسکایا

سیکنڈری سکول کی ایک طالب علم کی طرف سے۔"

ہم گھر کی کھیتی میں اگایا ہوا تیز تمباکو خاموشی سے پینے لگے۔ میں اس سے پوچھنے ہی والا تھا کہ وہ بچے کے ساتھ کہاں جا رہا ہے اور ان خراب سڑکوں پر اس کا گذر کیوں ہوا، کہ اس نے سوال کیا۔

"جنگ کا سارا زمانہ لڑتے رہے؟"

"تقریباً۔"

"فرنٹ لائن؟"

"ہاں۔"

"مجھے بھی مورچے پر مصیبتیں اٹھانی پڑیں۔ حد سے زیادہ۔"

اس نے اپنے سانولے بڑے بڑے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے کندھے جھکا لیے، اسے کن انکھیوں سے دیکھنے کے بعد مجھے بڑا عجیب سا لگا، کبھی آپ نے ایسی آنکھیں دیکھی ہیں، لگتا ہو جیسے ان پر راکھ چھڑک دی گئی ہے؟ ایسی آنکھیں جن میں تمنا اور الم کے نقوش اتنے گہرے اور واضح ہوں کہ ان سے نظر ملا کر نہ دیکھا جا سکے؟ میرے راہ چلتے دوست کی آنکھیں ایسی ہی تھیں،

اس نے جنگلے میں سے ایک خشک، مڑی ہوئی ٹہنی توڑی اور اس کی نوک سے ریت پر ایک عجیب سا نقش بنایا، پھر اس نے کہا۔ "بعض دفعہ مجھے رات کو نیند نہیں آتی، میں آنکھیں کھولے پڑا اندھیرے کو تکتا رہتا ہوں،،،،، زندگی! تو نے اندھا کس لیے کیا؟ تو نے مجھے اس طرح اپاہج کیوں بنایا؟ کیوں اتنی کڑوی سزا دی مجھ کو؟ اور مجھے کوئی جواب نہیں ملتا، نہ اندھیرے نہ اجالے، مجھے کوئی جواب نہیں ملتا، مجھے کبھی کوئی جواب نہیں ملے گا۔" اچانک اس نے خود کو سنبھالا، اور بڑے پیار سے اپنے بیٹے کو بٹوہ دے کر بولا، "جاؤ منے جا کر ندی کے کنارے کھیلو۔۔۔ بڑے بڑے دریاؤں کے کنارے ننھے لڑکوں کو بڑی دل چسپی کے سامان مل جاتے ہیں، لیکن اپنے پیر پانی میں نہ بھگو لینا۔"

جس وقت ہم خاموشی سے تمباکو پی رہے تھے، میں نے باپ بیٹے

کے سراپا کا جائزہ تیزی سے لیا تھا۔ اور مجھے ان کے متعلق ایک چیز بڑی عجیب سی لگی تھی۔ لڑکا معمولی لیکن پائے دار کپڑوں میں ملبوس تھا، سمور کے گھسے ہوئے استر والا لمبا گھیر دار کوٹ جس طرح اس پر فِٹ آتا تھا، اس کے ننھے سے بوٹ اس کے اُونی موزوں پر جس طرح فٹ کر کے پہنائے گئے تھے، ان سب چیزوں میں ایک عورت کے، ایک سگھڑ ماں کے ہاتھ کی جھلک تھی، لیکن باپ کا حلیہ کافی مختلف تھا۔ اس کی روئی دار صدری جگہ جگہ سے جلی ہوئی تھی اور اسے بھونڈے پن سے رفو کیا گیا تھا، اس کی گھسی ہوئی خاکی پتلون کا پیوند ٹھیک سے لگا تھا۔ اس میں بڑی بڑی مردانہ کھونپیں اور ٹھنگے بھرے گئے تھے۔ اس نے تقریباً نئے فوجی بوٹ پہن رکھے تھے لیکن اس کی موٹی موٹی اونی جرابوں میں سوراخ ہی سوراخ تھے۔ یہ چیزیں نسوانی انگلیوں سے ناآشنا معلوم ہوتی تھیں۔ میں نے طے کیا کہ یا تو یہ شخص رنڈوا ہے اور یا اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان کھٹ پٹ یا گڑبڑ ہے۔

وہ اپنے بیٹے کو پانی کی سمت دور دیکھا کیا رکھا تھا، اور پھر بات شروع کی۔ میں بڑے دھیان سے اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"پہلی بات یہ کہ میری زندگی بالکل معمولی تھی۔ میں صوبہ ووروینژ کا باشندہ ہوں۔ سن ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوا تھا۔ خانہ جنگی کے دنوں میں سرخ

فوج کے کیکو یذرسے ڈویژن میں تھا۔ ۱۹۲۱ء کے قحط میں، میں کیوبن چلا گیا۔ اور موروثی کسانوں کے لیے بیل کی طرح کام کرتا رہا ورنہ آج زندہ نہ ہوتا لیکن گھر پر میرا سارا کنبہ، ماں اور باپ فاقے سے مر گئے، چنانچہ میں اکیلا رہ گیا اور کوئی رشتے دار نہیں تھا۔ خیر سال بھر بعد میں کیوبن سے واپس آیا اپنا مکان فروخت کیا اور ورونیز چلا گیا، وہاں پہلے تو بڑھئی گیری کرتا رہا، پھر ایک کارخانے میں جا کر مستری کا کام سیکھا۔ اس کے بعد شادی کر لی۔ میری بیوی ایک یتیم خانے میں پلی بڑھی تھی۔ بڑی نیک بخت تھی، خوش مزاج، خدمت گزار اور بڑی بانکی تھی۔ میری طرح بھونڈی نہیں بچپن سے اسے معلوم تھا کہ دکھ کیسے ہوتے ہیں۔ دکھوں نے اس کے کردار پر اثر ڈالا تھا، مگر اسے صرف ایک رخ سے دیکھو تو وہ اتنی خوبصورت نہیں تھی، میرا مطلب سمجھے نا؟ ...... مگر میں تو اسے کسی ایک پہلو سے نہیں، نظر بھر کر اس کی آنکھوں میں دیکھتا تھا۔ اور دنیا میں اس سے زیادہ خوبصورت نہ تھی اور نہ ہو گی۔

"میں بعض مرتبہ کام سے تھکا ہارا اور حد سے زیادہ چڑچڑا گھر لوٹتا۔ لیکن وہ میری سختی کا جواب کبھی سختی سے نہ دیتی اتنی نرم مزاج اور لے زبان۔ ایسی بھلی مانس تنگی ترشی میں بھی ہمیشہ میرے زیادہ سے زیادہ آرام کا خیال رکھتی، اچھے اچھے کھانے پکاتی۔ اس کی صورت دیکھ

کر ہی میرا جی ہلکا ہو جاتا ہے۔ اور اس کے گرد بازو ڈال کر میں اس سے کہتا۔
"ایرینا، میں تم پر خواہ مخواہ چلاّ پڑا۔ آج کارخانے میں بہت برا دن گزرا۔"
اور پھر ہم دونوں میں صلح ہو جاتی اور مجھے سکھ چین کا احساس ہوتا۔ اور بھائی تم جانتے ہو پُرسکون گھریلو زندگی کا آدمی کے کام پر کتنا اچھا اثر پڑتا ہے؟ صبح کو میں بستر سے تیر کی طرح نکل کر کارخانے جا پہنچتا اور جس کام پر ہاتھ پڑتا نہ ناٹے سے پورا ہوتا چلا جاتا۔ گھروالی اگر سمجھدار ہو تو زندگی جنت ہے بھائی۔"

"بعض دفعہ تنخواہ ملنے پر میں دوستوں کے ساتھ پینے پلانے چلا جاتا۔ اور نشے میں دھت گھر لوٹتا۔ اس وقت تو میری لڑکھڑاتی چال کیلئے چوڑی سڑک بھی کافی نہ تھی۔ گلیوں کا تو ذکر ہی کیا۔ ان دنوں میں بہت مضبوط اور کڑیل تھا۔ کتنی ہی چڑھا جاؤں پہچان بھی لیتا اور بغیر کسی مدد کے خود ہی گھر پہنچ جاتا۔ لیکن اکثر گھر کے قریب پہنچتے پہنچتے حالت بالکل تباہ ہو جاتی اور میں چاروں ہاتھ پاؤں کے بل چلنے لگتا، تب بھی وہ بھلی مانس نہ چیخیں، نہ خفا ہوتی۔ میری ایرینا خالی مجھے دیکھ ہنسنے لگتی اور ہنستی بھی اس انداز سے کہ اس حالت میں بھی میں اس کی ہنسی کا برا نہ مان جاؤں وہ میرے جوتے اتار کر چپکے سے کہتی۔ آج تم دیوار کے قریب سونا۔ آندروشے، ورنہ نیند میں پلنگ سے لڑھک جاؤ گے۔" میں جیسی کے

بورے کی طرح دھم سے پلنگ پر گر پڑتا اور میرے چاروں طرف کی چیزیں گھومنے اور تیرنے لگتیں، مجھے نیند آجاتی اور احساس ہوتا کہ وہ ملائمت سے میرا سر سہلا رہی ہے، اور چپکے چپکے میٹھی میٹھی باتیں مجھ سے کر رہی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میری حالت پہ کڑھتی تھی۔

صبح کو وہ مجھ سے دو گھنٹے پہلے اٹھ جاتی تاکہ اتنی دیر میں میرے ہوش ٹھکانے آجائیں۔ اسے معلوم تھا کہ نشہ کے بعد میں کھانے کو ہاتھ نہ لگاتا تھا۔ سو وہ ککڑی کا اچار یا کوئی اور ایسی ہی چیز مجھے لاکر دیتی اور پھر نشہ سرن کرنے کے لیے ایک گلاس میں وڈکا بھر کر پلاتی۔ "لو اندر، لیکن پھر اتنی مت پی جانا۔" بھلا ایک آدمی ایسی بھلی عورت کو دھوکا کیسے دے سکتا تھا؟ میں گلاس چڑھا جاتا پیار کر کے اس کا شکریہ ادا کرتا، اور معصوم بھیڑ کی طرح کام پر روانہ ہو جاتا۔ لیکن اگر وہ کہیں وہ میرے شراب پینے پر جھگڑا فساد کرتی تو یقین کرو میں دوسری رات پھر اسی طرح دھت واپس آتا۔ اکثر گھروں میں بیویوں کی حماقت کی وجہ سے یہی ہوتا ہے، میں نے کئی مرتبہ دیکھا ہے، پتہ ہے تجھے۔"

"خیر، پھر بچے پیدا ہوئے۔ پہلے لڑکا، پھر دو لڑکیاں، اور اس وقت میں نے اپنے یار دوستوں سے قطع تعلق کر لیا، میں ساری تنخواہ گھر لے جاکر بیوی کو دے دیتا۔ اب خاندان بڑا ہو گیا تھا اور نشہ بازی کا

وقت نہیں تھا، چھٹی کے وقت بس ایک گلاس بیئر پی لیا کرتا تھا۔"

"۱۹۲۶ء میں مجھے موٹروں سے دلچسپی پیدا ہوئی میں نے موٹر چلانا سیکھا اور ایک لاری چلانے لگا۔ اب میں کارخانے میں واپس نہ جانا چاہتا تھا۔ لاری ڈرائیور کی زندگی بہت دلچسپ تھی۔ چنانچہ دس سال اس فراٹے سے نکل گئے کہ مجھے پتہ بھی نہ چلا۔ بالکل خواب جیسا تھا۔ مگر دس سال کی بھلا کیا حقیقت ہے؟ کسی آدمی سے جس کی عمر چالیس سال سے اوپر ہو پوچھ کر دیکھ لو کہ سال کس طرح نکلے چلے جاتے ہیں۔ ماضی دور دھندلکے میں چھپی ہوئی چراگاہ کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ آج صبح میں چراگاہ سے گذر رہا تھا اور ہر چیز صاف صاف دکھائی دے رہی تھی۔ بیس کلو میٹر نکل کر آگیا تو اب وہاں دھندلکا چھایا ہے۔ درخت، گھاس، کھیت، سب اس دھندلکے میں گڈمڈ ہو گئے ہیں۔

ان دس برسوں میں، میں نے دن رات کام کیا، خاصہ پیسہ کمایا اور ہم میاں بیوی بہتوں سے برے نہیں رہے۔ بچے ہماری ساری دھن دولت تھے، تینوں اسکول میں خوب ترقی کر رہے تھے، سب سے بڑا اناطولی تو حساب میں اتنا تیز نکلا کہ اس کا نام ماسکو کے ایک اخبار میں چھپ گیا پتہ نہیں اسے یہ ذہانت کس طرف سے ورثے میں ملی، لیکن میں تو اس پر فخر سے پھولا نہ سماتا تھا۔

دس برس میں ہم نے کچھ اندوختہ بھی کر لیا۔ اور جنگ سے پہلے ہم نے دو کمروں کا سائبان اور ننھی سی برساتی والی ایک کاٹیج بھی بنا لی اریناؔ نے دو بکریاں خرید لیں ہمیں اور کیا کرنا چاہیے تھا، بچوں کے دلیے کے لیے دودھ موجود تھا، سر پر چھت تھی، پاؤں میں جوتے تھے اور سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا البتہ یہ ہوا کہ میں نے گھر بنانے کے لیے جگہ اچھی نہیں چنی، اس کی زمین ہوائی جہاز کی فیکٹری سے زیادہ دور نہ تھی۔ اگر میں نے گھر کہیں اور بنایا ہوتا تو آج میری زندگی مختلف ہوتی۔

اور پھر۔۔۔۔۔ لڑائی چھڑ گئی۔ دوسرے ہی روز میرے پاس بھرتی کا پروانہ آن پہنچا اور اس کے دوسرے دن۔۔۔۔۔ "اسٹیشن پر رپورٹ کیجیے" کا حکم، میری بیوی بچوں نے مجھے رخصت کیا۔ ایرینا، اناطولی اور میری بچیاں ناسٹینکا اور اولیوسکا۔۔۔۔۔ بچوں نے ہمّت قائم رکھی مگر لڑکیاں آنسو نہ روک سکیں، اناطولی صرف تھوڑا سا لرزا جیسے اسے سردی لگ رہی ہو، اب وہ سترہ سال کا ہونے والا تھا، لیکن میری ایرینا۔۔۔۔۔ سترہ سال سے ہم اکٹھے تھے پر میں نے آج تک اس کی یہ حالت نہ دیکھی تھی۔۔۔۔۔ رات بھر میری قمیض اور شانے اس کے آنسوؤں سے بھیگتے رہے۔ اور صبح کو بھی اس کا یہی عالم تھا۔ ہم لوگ اسٹیشن پر پہنچے ہیں اس کی وجہ سے اتنا رنجیدہ تھا۔ کہ مجھ سے اس کا چہرہ نہ دیکھا گیا۔ اس

کے ہونٹ سوج چکے تھے، اور بال اس کی شال میں سے باہر بکھر آئے تھے۔ اس کی آنکھیں خالی خالی تھیں، اور وہ دیوانوں کی طرح خلا میں گھور رہی تھی۔ جب افسروں نے ٹرین پر چڑھنے کا حکم دیا، تو وہ مجھ سے لپٹ گئی اور اپنی بانہوں سے میری گردن جکڑ لی۔ وہ ایک ایسے درخت کی طرح کانپ رہی تھی جسے کلہاڑیوں سے کاٹ کر گرایا جا رہا ہو۔ بچوں نے اور میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی، پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ دوسری عورتیں اپنے شوہروں اور بیٹوں سے باتیں کر رہی تھیں پر میری گھر والی مجھ سے یوں چمٹی تھی جیسے پتی ٹہنی سے۔ گم سم، بس لرزے جا رہی تھی۔ "ایرینا...... میری جان، اپنا آپ سنبھالو" میں نے کہا...... "مجھ سے دو باتیں ہی کر لو کم از کم"...... اور اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے صرف اتنا کہا"...... اندرے، اندرے...... ہم...... اس دنیا میں ایک دوسرے سے پھر نہ ملیں گے۔"

"میرا دل اس کی حالت پر پھٹا جا رہا تھا۔ اور وہ یہ کہہ رہی تھی۔ اسے تو یہ سمجھنا چاہیئے تھا کہ اس سے جدا ہونا میرے لیے آسان نہ تھا۔ میں کسی ضیافت میں تو جا نہیں رہا تھا۔ مجھے غصہ آ گیا۔ اس کی گرفت سے نکل کر میں نے اسے پرے دھکیل دیا۔ اپنے حساب میں تو میں نے اسے بڑی نرمی سے دھکا دیا تھا، لیکن میں دیو زاد آدمی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹی پھر ننھے ننھے قدم رکھتی میری طرف آئی۔ میں نے گرج کر کہا، "رخصت

کرنے کا یہ طریقہ ہے؟ تم چاہتی ہو کہ میں بے موت مر جاؤں ۔۔۔۔؟"

پھر میں نے اسے اپنی باہوں میں لے لیا کیوں کہ اس کی حالت بہت ہی خراب تھی۔

پھر میں دفعتاً چپکا ہو گیا اور آواز اس کے حلق میں روندھ گئی۔ اس پر جو گزر رہی تھی وہ بخوبی سمجھ سکتا تھا۔ میں نے کنکھیوں سے اس پر نگاہ ڈالی۔ مگر اس کی بے جان، راکھ ایسی آنکھیں آنسوؤں سے عاری تھیں۔

میں اپنا سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اس کے بڑے بڑے ہاتھ اس کے پہلو میں ہلکے سے مرتعش تھے۔ اس کی ٹھوڑی اور منجمد ہونٹ کپکپائے۔

"جی چھوٹا نہ کر دیار ۔۔۔۔ بھول جاؤ ۔۔۔۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ لیکن شاید اس نے میری بات نہیں سنی۔ اپنے آپ پر بمشکل قابو پا کر اس نے یکایک ایک کرخت اور حیرت انگیز طور پر بدلی ہوئی آواز میں کہا ۔۔۔ "مرتے دم تک ۔۔۔۔ مرتے دم تک میں اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکتا۔ میں نے اسے کیسے دھکا دیا تھا" ۔۔۔

پھر میں بہت دیر تک چپ رہا۔ کاغذ موڑ کر سگریٹ بنانے کی کوشش کی لیکن اخبار کا ننھا پرزہ میری انگلیوں میں چرا اور تمباکو گھٹنوں پر بکھر گیا۔ آخر میں نے ایک بھدا سا سگریٹ تیار کیا، دو تین گہرے، بھوکے کش لگائے

"میں نے خود کو ایرینا سے چھڑایا۔ اور اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے پیار کیا۔ اس کے ہونٹ برف کی طرح ٹھنڈے تھے۔ بچوں سے رخصت ہو کر میں چلتی ہوئی ٹرین پر چڑھ گیا۔ ٹرین بہت آہستہ آہستہ روانہ ہوئی۔ اور اس میں بیٹھے ہوئے میں اپنے بیوی بچوں کے پاس سے دوبارہ گزرا۔ میرے یتیم سے بچے ایک دوسرے سے لپٹے کھڑے تھے۔ الوداع کے ہاتھ ہلا ہلا کر مسکرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن اپنی کوشش میں ناکام تھے۔ ایرینا نے اپنے ہاتھ اپنے سینے پر باندھ لیے تھے۔ اس کے ہونٹ چاک کی طرح سفید تھے اور وہ منہ ہی منہ میں کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ اور اس کا جسم سامنے کو یوں جھکا ہوا تھا جیسے وہ تیز ہوا کے تھپیڑوں کے مقابل میں چلنے کی کوشش کرتی ہو۔ اس کی یہ تصویر ساری عمر میرے سامنے رہے گی۔ سینے پر بندھے ہوئے ہاتھ، پھیلی ہوئی آنکھیں، آنکھوں میں آنسو۔ اسی انداز میں وہ میرے خوابوں میں آتی ہے۔ میں نے اسے دھکا کیوں دیا۔ جب مجھے اس کا خیال آتا ہے مجھے لگتا ہے، جیسے کند چھری میرے دل کے اندر اتر گئی ہو۔

ہم یوکرائن کے ایک مقام پر بیلایا تسیرکوف میں اپنے یونٹ پر بھیج دئیے گئے مجھے ایک تھری ٹنز ٹرک چلانے کے لیے دی

گئی جس میں میں محاذ پر گیا، تم کو لڑائی بتانا بے کار ہے، تم خود اس میں شامل رہ چکے ہو، تم جانتے ہو شروع شروع میں کیا ہوتا ہے۔ گھر سے سب کے خط آتے ہیں، لیکن خود زیادہ خط نہیں بھیجتے کبھی کبھار یہ گھسیٹ دیا جاتا ہے کہ "سب ٹھیک ہے۔ بس تھوڑا سا لڑنا بھڑنا پڑ رہا ہے۔ ہم ممکن ہے ذرا پیچھے ہٹیں لیکن بہت جلد ایسا دھاوا بولیں گے کہ سالے جرمنوں کو اپنی نانی یاد آجائے گی۔ اس کے علاوہ ان خطوں میں اور کیا لکھا جا سکتا ہے؟ ایسے بھیانک زمانے میں لکھنے لکھانے کی کسے کیا سوجھ سکتی ہے؛ اور میں تو یوں بھی کبھی روتے بیٹھنے کا قائل نہیں رہا۔ مجھے ان علی حورتوں سے سخت کوفت ہوتی ہے، جو خواہ مخواہ اپنے بیوی بچوں کو بلاناغہ روزانہ خط لکھ لکھ کر بھیجتے تھے۔ بڑی کٹھن زندگی ہے، شاید میں مارا جاؤں، ریزہ ریزہ ہو جاؤں۔" اور اس طرح یہ الو کے پٹھے اپنا مرثیہ لکھتے چلے جاتے تھے۔ کبھی ان کو یہ خیال نہ آیا کہ گھروں پر وہ نیک بختنیں اور ان کے بچے بھی اتنی ہی کٹھن زندگی کا سامنا کر رہے ہیں ارے وہ بیچاریاں تو سارے ملک کا بوجھ کندھوں پر اٹھائے ہیں۔ اور ہماری عورتوں اور بچوں کے کندھے بھی کتنے مضبوط تھے کہ اس بوجھ کے تلے دبے نہیں۔ اسے اٹھائے ہی رکھا بے جگری سے، اور اس پر ایک روتا بسورتا خط پہنچا تو بہادر سے بہادر بیوی کے قدم آپ سے آپ

لڑکھڑا جائیں گے کہ نہیں؟ یوں ہائے توبہ مچانا مرد آدمی کا کام ہے ؟ سپاہی بچے بھلا یوں روتے ہیں؟ پر اگر تم عورتوں کی طرح جھینکتے ہو تو بھائی جاؤ، لہنگا پہن کر کھیتوں میں کام کرو، گائیں دوہو، میدانِ جنگ میں کیوں جھک مار رہے ہو۔

"ابھی میں سال بھر ہی محاذ پر رہا تھا کہ دو بار زخمی ہوا ایک دفعہ بازو میں اور دوسری دفعہ ٹانگ میں، مگر زخم گہرے نہ تھے۔ پہلی بار تو ہوائی جہاز سے ایک گولی لگی۔ اور دوسری دفعہ پھٹنے والی گولی کا ٹکڑا ٹانگ میں گھس گیا۔ جرمنوں نے میرے ٹرک کو گولیوں سے چھلنی کر دیا، پر میری قسمت نے میرا ساتھ دیا، اور میں بچ گیا۔ لیکن اس کے بعد قسمت نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ ۴۲ء کی مئی میں لوزووینکی میں جرمنوں نے مجھے پکڑ لیا۔ بڑا گڑبڑ معاملہ تھا۔ جرمن تیزی سے حملہ کر رہے تھے اور ہماری ۱۲۲ ملی میٹر کی ہوٹزر بیٹریوں میں گولیاں ختم ہو چکی تھیں۔ ہم نے اپنی لاری کو پورم پور کارتوسوں سے بھر دیا۔ اس کام میں ایسا پسینے پسینے ہوا کہ میری قمیض پیٹھ سے چپک گئی۔ جرمن سر پر آن پہنچے تھے، اور ہمیں آگے بڑھنا لازمی تھا۔ بائیں ہاتھ کو جرمن ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ سامنے اور دائیں طرف زن زن گولیاں چل رہی تھیں۔ اور معاملہ خاصا ٹیڑھا ہو چکا تھا۔

"سوکولوف، تم آگے نکل سکتے ہو۔؟" کمپنی کے کمانڈر نے پوچھا اسے یہ سوال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ جب میرے ساتھی میرے اردگرد۔۔۔۔ ہو رہے تھے اس کا خیال تھا کہ اس وقت میں اطمینان سے بیٹھا رہوں گا؟" ۔۔۔۔۔۔"آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" میں نے کمانڈر کو جواب دیا۔ "میں یقیناً آگے بڑھوں گا۔"

"وہ ٹھیک ہے، چلو۔" اس نے کہا۔ "ایک دم۔۔۔ دیر مت لگاؤ۔"

میں نے دیر نہیں لگائی۔ میں نے ساری عمر گاڑی اس طرح نہ چلائی تھی۔ مجھے پتہ تھا کہ لاری میں آلو نہیں لدے ہیں۔ اور مجھے بے حد احتیاط اور چوکسی سے کام لینا ہے۔ مگر اس وقت خطرے کی کسے پرواہ تھی۔ جب کہ میرے جیالے ساتھی، یہ جوان، مورچے پر خالی ہاتھ لڑ رہے تھے۔ اور سڑک پر زبردست گولہ باری ہو رہی تھی۔ چھ کلومیٹر طے کر کے میں مورچے کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ سڑک سے اتر کر مجھے اس کھڈ میں اترنا تھا۔ جہاں ہماری بیٹری موجود تھی۔ کہ کیا دیکھتا ہوں کہ۔۔۔۔۔ ہماری انفنٹری سڑک کے دونوں طرف کھیتوں میں بے تحاشہ بھاگتی ہوئی پیچھے ہٹ رہی ہے۔ اور ان کے چاروں طرف گولے پھٹ رہے ہیں اب کیا کروں؟ میں واپس نہیں جا سکتا۔ اور بیٹری تک پہنچنے کے لیے ایک کلومیٹر

کا فاصلہ باقی ہے. میں سڑک پر سے مڑ چکا تھا مگر اپنے جوانوں تک نہ پہنچ سکا. ایک دور مار توپ کا گولہ میرے ٹرک کے پاس آن کر گرا. مجھے کوئی دھماکہ نہ سنائی دیا. بس جیسے میرے دماغ کے اندر کوئی چیز پھٹ گئی پھر اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں رہا کیسے زندہ رہا؛ کتنی دیر اس گڑھے میں گرا رہا، کچھ معلوم نہیں، جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میرا سر اس طرح پھٹ رہا تھا جیسے مجھے سخت اور تیز بخار ہو. دنیا اندھیر تھی. کندھے میں کوئی چیز چبھی جا رہی تھی۔ سارا جسم اس طرح دکھے جا رہا تھا. جیسے کسی نے متواتر دو دن تک جو چیز ہاتھ میں آئی. اس سے جی بھر کر پیٹا ہو. میں پیٹ کے بل اِدھر اُدھر کھسکنے کی کوشش کرتا رہا. اور آخر اٹھ کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے ابھی تک احساس نہ تھا، کہ میں کہاں ہوں اور مجھے کیا ہو گیا ہے، میری یادداشت بالکل غائب ہو چکی تھی. لیکن مجھے لیٹنے سے ڈر لگ رہا تھا. مجھے خوف تھا کہ اگر ایک دفعہ لیٹ گیا تو پھر دوبارہ نہ اٹھوں گا. چنانچہ میں ہوا میں جھومتے ہوئے درخت کی طرح ایک طرف کو لڑکھڑا گیا.

جب ہوش آیا اور چاروں طرف دیکھا تو ایسا لگا جیسے کسی نے میرے دل کے گرد چھٹیاں لگا دی ہیں. میری لاری کے سارے کاٹھ کباڑ بکھرے پڑے تھے. لاری کے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے تھے. اور وہ اوندھی

پڑی تھی اور لڑائی ..... لڑائی میری لپٹنٹ پر جاری تھی۔ جی ہاں .....
لڑائی میرے عین پیچھے اسی طرح جاری تھی۔

جب یہ حقیقت مجھ پر روشن ہوئی۔ تو مجھے یہ بتاتے ہوئے شرم نہ آئے گی کہ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اور میری ٹانگیں بے جان ہو گئیں۔ مجھے لگا جیسے کلہاڑی چل گئی ہو مجھ پر۔ کیونکہ میں دشمن کے مورچے کے اندر گھر چکا تھا، یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ اب میں فسطائیوں کا قیدی تھا..... اسے کہتے ہیں جنگ .....

نہیں بھائی ..... یہ سمجھنا آسان نہیں ہے کہ اپنی مرضی کیخلاف آپ جنگی قیدی بن گئے۔ جن پر یہ بپتا نہ گذری ہو وہ یہ سمجھ بھی نہیں سکتے۔

"سو میں چھپا پڑا ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ سنتا رہا۔ چار اوسط سائز کے جرمن ٹینک زناٹے سے اسی سمت نکل گئے جدھر سے میں آیا تھا۔ ذرا سوچ مجھ پر کیا گزر رہی ہو گی۔ پھر توپیں لادے ہوئے ٹریکٹر آئے۔ پھر ایک سفری باورچی خانہ۔ پھر انفنٹری۔ زیادہ آدمی نہیں تھے۔ صرف ایک کمپنی رہی ہو گی۔ میں کنکھیوں سے ان کو دیکھ لیتا۔ اور پھر مٹی میں اپنا منہ چھپا لیتا۔ ان کو دیکھ کر میرا جی چاہتا کہ بس مر جاؤں۔"

"جب مجھے خیال ہوا کہ پورا دستہ گزر چکا ہے تو میں نے سر اٹھایا اور سو گز پرے چھ "سب مشین گنرز" مارچ کرتے دکھائی دیئے، میرے دیکھتے دیکھتے وہ سڑک پر سے مڑ کر سیدھے میری جانب آئے، چھیوں کے چھیوں ۔۔۔۔ اور بالکل چپ چاپ میں نے سوچا بس اب اپنا خاتمہ ہے، چنانچہ میں کھسک کر اٹھ بیٹھا۔ کیونکہ میں لیٹے لیٹے نہیں مرنا چاہتا تھا۔ پھر میں کھڑا ہو گیا۔ ان میں سے ایک مجھ سے چند قدم ادھر ٹھٹھک گیا۔ اور جھٹکے کے ساتھ کندھے سے بندوق اتاری۔ عجب تماشہ ہے آدمی بھی۔ اس طرح مجھے بالکل ڈر نہ لگا۔ دل میں ذرا سی بھی کپکپی پیدا نہ ہوئی۔ میں نے اس جرمن کو دیکھا اور سوچا۔ "چھوٹا سا دھماکا ہوا، پتہ نہیں گولی کا نشانہ کدھر لگائے گا یہ! میرے سینے پر یا سر پر۔۔۔؟ میرے جسم کے کون سے حصے کو وہ گولی سے اڑائے گا۔۔۔ گویا یہ کوئی خاص بات تھی۔

لڑکا سا تھا وہ جرمن۔ اچھی کاٹھی، سیاہی مائل بال، پر اس کے ہونٹ دھاگے جیسے پتلے تھے اور اس کی آنکھوں میں بڑی کمینی سی چمک تھی۔ یہ آدمی مجھے گولی مارنے میں ذرا بھی توقف نہ کریگا۔ میں نے سوچا اور سچ مچ اس نے اپنی بندوق تان لی۔ میں نے ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھا، پر کچھ نہیں بولا۔ دوسرا والا جو کارپورل یا کچھ اور تھا،

اور اس سے بھی بڑا تھا، خاصا عمر رسیدہ زور سے چلایا اور لڑکے کو ایک طرف دھکیل کر میری طرف آیا۔ اپنی زبان میں کچھ بڑبڑایا، میری داہنی کہنی موڑی اور میرے پٹھوں کو محسوس کیا۔ "اور وہ ۔۔۔۔" اس نے کہا اور سڑک کی طرف اشارہ کیا، جہاں سورج غروب ہو رہا تھا۔ گویا کہتا ہو ۔۔۔ "جا بے خر ۔۔۔ ہماری ریخ کے لیے کام کر بہت چالاک، کنجوس ٹائپ تھا۔ وہ سوُر کا بچہ۔

کالے بالوں والے کی نظر میرے بوٹوں کی طرف تھی جو بہت مضبوط تھے، اس نے اشارہ کیا کہ میں بوٹ اتار دوں، میں نے زمین پر بیٹھ کر بوٹ اتارے اور اس کے حوالے کئے جھپٹ کر اس نے میرے ہاتھ سے چھین لیے میرے جوتے چنانچہ میں نے پیروں کی پٹیاں بھی اتار کر اسے دے دیں اور زمین پر بیٹھے بیٹھے سر اٹھا کر اسے دیکھتا رہا، اس نے چلا چلا کر گالیاں دیں اور پھر بندوق تان لی۔ باقی جرمن زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔ پھر وہ سب مارچ کرتے ہوئے روانہ ہو گئے کالے بالوں والے نے سڑک پر پہنچنے سے پہلے تین بار پلٹ پلٹ کر مجھے دیکھا، غصے کے مارے۔ اس کی آنکھیں نوجوان بھیڑیے کی طرح چمک رہی تھیں، گویا میں نے اس کے بوٹ اس کے پاؤں سے اتروا لیے تھے۔

اچھا بھائی! اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں سڑک پر پہنچا، ایک موٹی سی گالی دی اور قیدی کی حیثیت سے پچھم کی سمت چل پڑا لیکن مجھ سے چلا نہیں جا رہا تھا، اور گھنٹے بھر میں ایک کلو میٹر ہی طے کر سکتا تھا۔ شرابیوں کی طرح لڑکھڑاتا سیدھے چلتے چلتے اچانک کوئی چیز سڑک کے دائیں طرف سے بائیں طرف کو دھکا دے دیتی، آپ ہی آپ ......

ابھی میں کچھ ہی دور چلا ہوں گا کہ میرے ہی ڈویژن کے چار جوان مجھ سے آملے، وہ دس جرمن بندوقچیوں کے پہرے میں تھے۔ ان میں سے ایک جرمن پہرہ دار نے آن کی آن میں آگے آکر بندوق کا دستہ میرے سر پر مارا، اگر میں نیچے گر گیا ہوتا تو اس سور کے بچے نے ایک گولی کے ذریعے مجھے مار ہی دیا ہوتا۔ لیکن ایک روسی جوان نے ترنت آگے بڑھ کر مجھے گرتے سے سنبھال لیا۔ اور قیدی دستے کے اندر کھینچ کر کچھ دیر تک مجھے تقریباً گود میں اٹھائے رہا۔ جب میرے اوسان بجا ہوئے تو ان میں سے ایک نے چپکے سے کہا، "خدا کے لیے گرنا مت، جب تک دم میں دم ہے چلتے رہو، ورنہ فوراً گولی مار دی جائے گی۔"

غروب آفتاب کے وقت جرمنوں نے حفاظتی دستے میں اضافہ کر لیا، بیس بندوقچی ایک لاری میں بیٹھ کر آئے اور ہمیں زیادہ تیزی

سے ہنکانے لگے، جو روسی قیدی بہت بری طرح زخمی تھے، اور چل نہ سکتے تھے۔ ان کو سڑک پر ہی گولی مار دی گئی۔ ان قیدیوں نے فرار ہونے کی کوشش کی مگر وہ یہ بھول گئے کہ کھلی چاندنی رات میں آپ ایک میل دور سے بھی دکھائی دے سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ آدھی رات کو ہم ایک گاؤں میں پہنچے۔ جو آدھا میل دور تھا، ہمیں ایک گرجے میں ٹھونس دیا گیا، جس کا مینارہ تباہ ہو چکا تھا۔ رات ہم نے پتھریلے فرش پر گذاری، ہم میں سے کسی کے پاس اوور کوٹ نہ تھا

بعض جوانوں کے پاس وردی تک نہ تھی۔ محض سوتی بنیانیں پہنے ہوئے تھے، یہ نوجوان زیادہ تر نان کمیشنڈ افسر تھے۔ اور اپنی وردیاں انہوں نے اس لیے اتار دی تھیں کہ ان کے عہدے پہچانے نہ جا سکیں، مشین گن چلانے والے جوانوں کے پاس بھی وردیاں نہیں تھیں کیونکہ صرف پتلونیں پہنے پہنے جس طرح وہ مشین گنوں پر تعینات تھے، اسی حالت میں قید کر لیے گئے تھے،

رات کو موسلا دھار بارش ہوئی اور ہم شرابور ہو گئے، گرجے کی چھت بمباری سے تباہ ہو چکی تھی۔ قربان گاہ تک بارش سے تر بتر ہو گئی، رات بھر ہم اس گرجا گھر میں اسی طرح کھڑے رہے اندھیرے باڑے میں مقید بھیڑوں کی طرح، رات میں کسی وقت کسی نے میرا بازو چھو کر پوچھا،

"کامریڈ تم زخمی ہو؟"۔۔۔۔۔

"کیوں؟۔۔۔۔ کیوں پوچھتے ہو؟"۔۔۔۔ میں نے سوال کیا۔

"میں ڈاکٹر ہوں، شاید تمہاری مدد کر سکوں۔"

میں نے بتایا کہ میرا بایاں کندھا بری طرح چٹخ رہا ہے۔ اور سوج گیا ہے۔ بے حد درد ہو رہا ہے۔ اور وہ سختی سے کہتا ہے "وردی اور بنیان اتار دو" میں نے کپڑے اتار دیئے اور وہ پتلی پتلی انگلیوں سے میرے کندھے کا معائنہ کرنے لگا۔ اور میرا درد زیادہ ہو گیا۔ میں نے بھینچ کر کہا۔

"تم گھوڑا ڈاکٹر معلوم ہوتے ہو۔ انسانوں کے ڈاکٹر نہیں ہو۔ ایسا کیوں دباتے ہو یار! میری جان نکل گئی ہے بے رحم آدمی منحوس"

لیکن وہ اسی طرح ٹٹولتا رہا اور خفگی سے بولا۔

"چپ رہو، تم مجھ سے اس طرح بات نہیں کر سکتے، سمجھے۔۔۔ ننھے رہو تارے تو تمہیں اب نظر آئیں گے منچو۔۔۔۔"

پھر اس نے میری بانہہ اس طرح مروڑی کہ میری آنکھوں کے نیچے شرارے ناچ اٹھے۔

جب ہوش ٹھکانے ہوئے تو میں نے کہا۔

"اب کیا کرنا ہے، فاشسٹ کے بچے، میرا بازو پہلے ہی ٹکڑے

ٹکڑے ہو چکا ہے اور تو اور بھیس بھرے دے رہا ہے۔ کمبخت"

اس کی مدھم سی ہنسی میں نے سنی اور اس نے کہا:

"میرا خیال تھا کہ جب میں بازو سروڑوں گا تو تم مجھے مار بیٹھو گے، لیکن تم کافی نرم مزاج آدمی ہو، تمہارا بازو ٹوٹا نہیں ہے، اپنی جگہ سے کھسک گیا تھا۔۔۔۔۔۔ میں نے واپس اس کو اپنی جگہ پر پہنچا دیا ہے۔۔۔۔۔۔ اب کیسی طبیعت ہے؟۔۔۔۔ بہتر؟"

اور سچ مچ درد تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ میں نے اس کا بےحد شکریہ ادا کیا اور وہ تاریکی میں اسی طرح آہستہ سے پوچھتا رہا:

"کوئی اور زخمی ہے۔۔۔۔؟"

ایسا بھلا ڈاکٹر تھا وہ۔ اس بھیانک قید میں، اس گھور اندھیرے میں اپنا شاندار کام کرتا رہا"

"بڑی بے چین رات تھی۔ جرمنوں نے ہمیں حوائج کے ضرور یہ کے لیے بھی باہر نہ جانے دیا۔ دو دو کی جوڑی میں گرجا کے اندر نکالتے ہوئے کمانڈر نے یہ ہم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا اور بدقسمتی سے ہم میں سے ایک باایمان عیسائی کو باہر جانے کی ضرورت شدت سے لاحق تھی آخرکار وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"میں خدا کے گھر کو ناپاک نہیں کر سکتا" وہ بولا" میں مومن ہوں۔

میں عیسائی ہوں۔ لڑکو بتاؤ۔ میں کیا کروں۔''

اور تم کو پتہ ہے۔ ہم لوگ کس قسم کے ہیں۔ ہم میں سے کچھ ہنس پڑے کچھ گالیاں بکنے لگے۔ اور چند ایک نے طرح طرح کے مشورے دے کر اس کا نتھنوں میں دم کر دیا۔ اس بے چارے کی وجہ سے ہم سب ذرا ہنس بول لیے۔ مگر انجام بہت بھیانک ہوا۔ اس غریب نے دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا باہر جانے کی اجازت چاہی۔ جواباً ایک فاشسٹ نے باہر سے مشین گن چلا دی۔ دروازے کو توڑتی ہوئی گولیوں کی آگ نے اس مومن عیسائی کے ساتھ ساتھ تین اور کو بھی بھون کے رکھ دیا تھا۔ اس بری طرح زخمی ہوا کہ صبح ہوتے ہوتے اس نے بھی دم توڑ دیا۔

"ہم نے لاشوں کو گھسیٹ کر ایک کونے میں ڈالا اور چپ چاپ بیٹھ کر سوچنے لگے کہ ہماری قید کی ابتداء بہت خوشگوار نہیں ہے۔ اس کے بعد ہم نے سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ کون کہاں سے آیا ہے۔ اور کسطرح پکڑا گیا۔ جو جوان ایک ہی پلٹن یا کمپنی کے تھے وہ اندھیرے میں ایک دوسرے کو چپکے چپکے پکارنے لگے میرے برابر میں دو آوازیں کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ ایک بولا۔" کل اگر جرمنوں نے ہمیں آگے لے جانے سے پہلے کو مبیاروں، کمیونسٹوں اور یہودیوں کو سامنے

آنے کا حکم دیا۔ تو سیاں پلیٹن کمانڈر تم اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش مت کرنا۔ تمہارا خیال ہے کہ وردی اُتار دینے کی وجہ سے تم کو معمولی سپاہی سمجھا جائے گا۔؟ میں تمہاری خاطر نقصان اٹھانے کو قطعی تیار نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے تم کمیونسٹ ہو۔ مجھے یہ بھی یاد ہے۔ کس طرح تم نے کوشش کی تھی، کہ میں پارٹی میں شامل ہو جاؤں۔ اب تم کو اس کی سزا ملنے والی ہے۔ یہ میرے بائیں ہاتھ والے کی آواز تھی۔ اب اس کے برابر بیٹھے ہوئے نوجوان کی آواز سنائی دی۔۔۔۔" مجھے ہمیشہ سے پتہ تھا کہ تم ایک نہایت فضول اور بے ہودہ آدمی ہو۔ کرو ژنیو۔ خصوصاً جب تم نے اپنی جہالت اور بے علمی کا جھوٹا بہانہ کر کے پارٹی میں شرکت سے انکار کیا لیکن میں یہ نہ سمجھتا تھا کہ تم غدار بھی نکلو گے۔ تم چودہ برس کی عمر تک اسکول گئے تھے یا نہیں؟۔۔۔۔۔ اور دوسرے نے اب ذرا سا بے پرواہی سے جواب دیا۔ ہاں گیا تھا۔۔ ،،،، تو پھر۔۔۔؟ دونوں بہت دیر تک چپ رہے۔ اور پلیٹن کمانڈر نے دھیمے سے کہا۔۔۔۔" مجھے دشمنوں کے حوالے مت کرو کامریڈ کروژنیو۔" اور دوسرا ہنس کر بولا،" کامریڈ تو مورچے کے دوسری طرف رہ گئے، میں تمہارا کوئی کامریڈ وامریڈ نہیں ہوں۔ خواہ مخواہ مجھ سے التجا مت کرو۔ میں بہر حال جرمنوں کے سامنے سب سے پہلے تمہاری طرف اشارہ کرنے والا ہوں۔۔۔۔۔۔ مجھے اپنی جان زیادہ عزیز ہے۔"

پھر خاموشی چھا گئی، اور اس ذلیل ترین غداری کے خیال ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، نہیں، میں نے سوچا، سؤر کے بچے تمہارے کمانڈر کے خلاف غداری نہیں کرنے دوں گا۔ تم اس گرجا گھر سے اپنے پیروں پر باہر نہیں نکلو گے۔ تمہیں گھسیٹ کر لے جایا جائے گا۔ اتنے میں پو پھٹنے لگی، اور مجھے ایک لمبا چوڑا موٹا شخص سر کے نیچے بازو رکھے چت لیٹا دکھائی دیا۔ اور اس کے برابر میں ایک بہت کمسن چھوٹی سی ناک والا لڑکا ایک بنیان پہنے گھٹنوں کو بازوؤں کے حلقے میں لیے بیٹھا تھا، اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ یہ لڑکا اس موٹے خصی گھوڑے سے نہیں نمٹ سکے گا۔ میں نے سوچا، اس کمینے کا کام مجھے ہی تمام کرنا ہوگا۔

"تم پلٹن کمانڈر رہو۔۔۔۔؟"

اس نے کچھ نہیں کہا، صرف اس بات میں سر ہلا دیا۔

"بدمعاش تم کو دشمن کے حوالے کرنے کی کوشش میں ہے؟" میں نے چت لیٹے ہوئے آدمی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

لڑکے نے پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں نے کہا،" اس کی ٹانگیں پکڑ لو۔ تاکہ وہ دولتی نہ جھاڑے۔ جلدی کرو۔"۔۔ اور کود کر میں اس آدمی پر چڑھ بیٹھا اور اس کا ٹینٹوا دبا لیا۔ اسے چلانے کی بھی مہلت نہ مل سکی چند منٹ تک میں نے اس

کا گلا دبائے رکھا، پھر ذرا انگلیاں ڈھیلی کیں۔ اس طرح ایک اور غدار سے نجات ملی۔ اس کی زبان باہر لٹک چکی تھی۔

لیکن اس کے بعد مجھے بہت ہی شدید کوفت ہوئی۔ اور میرا بری طرح جی چاہا کہ میں اپنے ہاتھ دھولوں۔ گویا میں نے ایک انسان کو نہیں سانپ کو مارا تھا۔ زندگی میں پہلی بار میں نے کسی کو قتل کیا تھا۔ اور میرا مقتول ہمارے اپنے ساتھیوں میں سے تھا۔ ہمارا اپنا۔۔۔۔؟ ہرگز نہیں وطن فروش تھا کمبخت۔ میں کھڑا ہوگیا اور بلیٹن کمانڈر سے بولا۔۔۔۔ "یہاں سے ہٹ آؤ کامریڈ ۔۔۔۔۔ گرجا کافی بڑا ہے "۔۔۔۔۔۔

وہ صبح کو جیسا کہ آنجہانی کرذیفو نے کہا تھا ہم سب کو گرجا کے باہر قطار میں کھڑا کیا گیا۔ مشین گن والے ہمارے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے اور تین ایس ایس افسروں نے ہم سے ایسے لوگوں کو چھانٹنا شروع کیا جو ان کے خیال میں خطرناک تھے۔ انہوں نے سوال کیا کہ کمیونسٹ کون کون ہے، افسر کون سے ہیں۔ اور کومیسار کتنے ہیں۔ مگر ان کو کامیابی نہ ہوئی۔ ان کو ہم لوگوں میں کوئی ایسا نہ ملا جو غداری کر کے مطلوبہ لوگوں کی طرف اشارہ کرے کیونکہ ہم میں سے آدھے کمیونسٹ تھے۔ بہت سارے افسر تھے اور کئی کومیسار بھی موجود تھے۔ جرمنوں نے ہم دو میں سے صرف چار آدمی چن لیے ایک یہودی اور تین روسی سپاہی۔ روسی اپنے سیاہ گھنگریالے بالوں اور نہ

سیاہ آنکھوں کی وجہ سے مصیبت میں پھنسے۔ ایس ایس کے سپاہی سیدھے ان کے پاس آ گئے بولے۔

"یہودی۔۔۔۔؟"

جس سے انہوں نے سوال کیا تھا۔ وہ کہتا ہی رہا کہ وہ روسی ہے مگر وہ کہاں سنتے تھے، انہوں نے للکارا۔

"باہر آؤ۔"

اور بس ان چاروں کا فیصلہ ہو گیا۔

جرمنوں نے ان بیچاروں کو گولی مار دی اور ہم کو اور آگے ہنکایا۔ پلیٹن کمانڈر جس نے تبیش غدار کا گلا گھونٹنے میں میری مدد کی تھی۔ میرے ساتھ ساتھ پوزنان تک گیا۔ مارچ کے پہلے روز وہ چلتے چلتے میرے قریب آ جاتا۔ اور شکر گذاری سے میرا ہاتھ دباتا۔ پوزنان میں ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ یہ اس طرح ہوا۔

"دیکھو دوست، جب سے میں قید ہوا تھا میں بھاگ نکلنے کی فکر میں تھا، لیکن اسکیم پکی کر لینا چاہتا تھا۔ پوزان تک پہنچتے پہنچتے تو مجھے کوئی موقع نہ ملا۔ وہاں جرمنوں نے ہمیں باقاعدہ ایک کیمپ میں رکھا۔ کیمپ میں مجھے موقع مل گیا۔ مئی کے آخر میں انہوں نے کیمپ کے قریب ایک جنگل میں بھیج دیا۔ جہاں ہمیں مرنے والے قیدیوں کی قبریں کھودنی ہوتی

تھیں، ہمارے بہت سے جوان پیچش سے مر گئے۔ جب میں پوزنان میں قبریں کھود رہا تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا دو پہرے دار کھانا کھانے کے لیے ایک جگہ ٹک گئے تھے۔ تیسرا دھوپ میں اونگھ رہا تھا۔ سو میں نے اپنا پھاوڑا رکھا اور پھرتی سے ایک جھاڑی میں چھپ گیا۔ پھر میں سرپٹ دوڑا۔ ناک کی سیدھ جدھر سورج نکل رہا تھا۔

پہرے دار مجھے فوراً نہ دیکھ پائے۔ میں سوکھ کر کانٹا ہو چکا تھا۔ پھر بھی نہ جانے کہاں سے مجھ میں اتنی طاقت آگئی کہ میں دن بھر میں قریب چالیس کلومیٹر بھاگتا چلا گیا۔

چوتھے روز میں اس سے بہت دور نکل چکا تھا۔ تب ان جرمنوں نے مجھے پکڑ لیا۔ انہوں نے میرے پیچھے شکاری کتے لگا دیے تھے اور انہوں نے مجھے جئی کے کھیت میں آلیا۔ جس کی ابھی کٹائی نہیں ہوئی تھی۔ منہ اندھیرے میں نے خود کو کھلے میدان میں پایا۔ جو جنگل سے قریب تین کلومیٹر دور تھا۔ میں دن کی روشنی میں باہر نکلنے سے ڈر رہا تھا۔ سو جئی کے کھیت میں چھپا لیٹا رہا۔ تھوڑے سے دانے توڑ کر میں نے جیب میں بھر لیے اتنے میں کتوں کے بھونکنے کی آواز اور موٹر سائیکل کے گڑگڑانے کی آواز سنائی دی میرا کلیجہ منہ کو آگیا۔ کیونکہ اب کتے سر پہ پہنچ چکے تھے چت لیٹ کر میں نے سر بانہوں میں چھپا لیا۔ تاکہ کتے میرا چہرہ نہ بھنبھوڑ لیں

خیر وہ اوپر آن پہنچے ایک منٹ میں انہوں نے میرے چیتھڑوں کو پارہ پارہ کر دیا، اور میں بالکل ننگا پڑا رہ گیا، وہ مجھے جئی کے پودوں میں گھسیٹتے پھرے میری چھیا لیدر کر ڈالی، اور آخر میں ایک جفادری کتے نے اپنے پنجے میرے سینے پر گاڑ کر میرے حلق پر منہ مارا، لیکن فوراً کاٹا نہیں۔

"اتنے میں دو جرمن موٹر سائیکلوں پر سوار آنازل ہوئے، پہلے انہوں نے پیٹ بھر کر مجھے پیٹا، پھر کتے میرے اوپر چھوڑ دیئے۔ میرے گوشت کے لوتھڑے کے لوتھڑے علیحدہ ہو گئے، اسی حالت میں میرا ننگا جسم خون سے لت پت تھا جرمن مجھے کیمپ واپس لے گئے۔ بھاگ نکلنے کی سزا میں ایک مہینہ مجھے کال کوٹھڑی میں رکھا گیا۔ پر میں زندہ رہا، ہاں بھائی میں کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو زندہ رکھنے میں کامیاب ہی رہا

"قید میں جو کچھ مجھے بھگتنا پڑا اس کی یاد ہی بہت بھیانک ہے۔ اس کا ذکر تم سے کیسے کروں جو جرمنی میں ہم لوگوں پر گزری، میرے ساتھیوں کو کیمپ میں انتہائی تکلیفیں اور عذاب دے دے کر جس طرح ہلاک کیا میں سوچتا ہوں تو میرا کلیجہ منہ کو آتا ہے اور سانس گھٹنے لگتی ہے۔

دو سال تک انہوں نے ہمیں جانوروں کی طرح ادھر سے ادھر ہنکایا۔ شاید میں نے مختلف کیمپوں میں آدھے جرمنی کا چکر لگا لیا، سیکسنی میں، میں نے نمک کے کارخانے میں کام کیا، رُہر میں کانوں سے پتھر کا کوئلہ نکالتا

رہا۔ یوریا میں میاتے مچاوڑے چلاتے تھو رنگین میں میں نے اپنا خون پسینہ ایک کیا، جرمنی کی سرزمین کے چپے چپے کو میں نے روند ڈالا، وہاں کے قدرتی مناظر بہت مختلف ہیں، مگر ہمارے جوانوں کو وہ اسی طرح سارے میں گولیاں مارتے رہے، اور وہ خبیث ملعون سانپ اور کیڑے ہم کو اس طرح پیٹتے تھے، کہ ہمارے یہاں آدمی جانوروں کو بھی یوں نہیں مارتے ۔۔۔۔ ۔۔۔ مکے، لاتیں، کوڑے، ربڑ کے ہنٹر، لوہے کی سلاخیں، بندوق کی نالیاں اور ڈنڈے،

جرمن ہمیں محض اس قصور پہ پیٹتے تھے، کہ ہم روسی تھے، اور ابھی تک زندہ تھے، اور ان کے لیے بے گار کر رہے تھے۔ اور اگر آپ نے ان کو ذرا ترچھی نظر سے دیکھا، ایک قدم غلط رکھا، ان کے حکم پر فوراً نہ پلٹے اور دھوں دھواں دوں پٹائی شروع۔ پیٹتے پیٹتے وہ چاہتے تھے کہ ایک روز ہم بے جان ہو کر گر پڑیں، کہ ہمارا اپنا خون ہمارے حلق میں پھنس جائے، اور ہم جہنم رسید ہوں، شاید ساری جرمنی میں اتنی بھٹیاں اور تندور نہیں تھے، جن میں ہم کو ٹھونس دیا جاتا۔

ہر جگہ انہوں نے ہمیں ایک سی غذا دی ۔۔۔۔ ڈیڑھ سو گرام روٹی جس میں آدھا بھوسہ ہوتا۔ اور شلجم کا پتلا سا شوربہ، کئی جگہ پہ ہمیں انہوں نے گرم پانی پلایا، کئی جگہ بالکل پیاسا رکھا، لیکن بتانے کی کیا۔

ضرورت ہے۔ تم خود اندازہ کر لو، جنگ سے پہلے میرا وزن چھیاسی کلوگرام تھا، اور خزاں تک پہنچتے پہنچتے میں پچاس کلوگرام بھی نہ رہا، ہڈی اور چمڑا رہ گیا، اور اتنی طاقت کہ بس ان ہڈیوں کو سنبھالے رہوں، لیکن محنت اور بے گار لازمی تھی، بغیر چوں چرا کئے اور کام ایسا تھا، جو گاڑی میں چلنے والے گھوڑے بھی نہ سہار سکتے تھے،

ستمبر کے شروع میں ہم ایک سو بیالیس سوئیٹ جوانوں کو انہوں نے کسترین کے کیمپ سے کیمپ بی ۱۴ میں منتقل کر دیا، یہ کیمپ ڈرلیسڈن کے نزدیک ہی تھا، اس وقت کیمپ میں دو ہزار جنگی قیدی موجود تھے ہم پتھروں کی کان میں ان کے جرمن پتھر اپنے ہاتھوں سے کاٹتے، ہر آدمی کو چار کیوبک کلو میٹر روزانہ کاٹنے پڑتے تھے، اور ایسے ایسے آدمی جو کمزوری اور ناطاقتی سے نڈھال تھے، دو مہینے بعد ہم ایک سو بیالیس آدمیوں میں سے صرف ستاون زندہ بچے، ہمیں اپنے ساتھیوں کو دفن کرنے کا وقت بھی نہیں ملتا تھا، پھر کیمپ میں یہ افواہ پھیلی کہ جرمنوں نے اسٹالن گراڈ پر قبضہ جما لیا۔ اور سائبیریا میں داخل ہو رہے ہیں ایک کے بعد ایک مصیبتیں بڑھتی گئیں، وہ ہمیں زمین پر گرا کر اس طرح دبائے رہتے کہ ہم اپنی آنکھیں بھی اوپر نہ اٹھا سکیں، جیسے ہم ہی نے ان سے کہا تھا کہ ہمیں جرمن دھرتی سے اس طرح چپکا دو اور ہر روز کیمپ کے

پہریدار ہمارے سر پر سوار ہو کر شرابیں پیتے، گانے گاتے اور ہلڑ مچاتے۔
ایک شام ہم کام کے بعد اپنے جھونپڑے پر لوٹے، دن بھر بارش ہوتی رہی تھی، اور ہمارے چیتھڑے شرابور تھے۔ میخ ہوائیں ہم تھر تھر کانپ رہے تھے، اور ہمارے دانت جو بج رہے تھے، وہ الگ۔ اپنے آپ کو خشک کرنے یا ذرا سی گرمی حاصل کرنے کی کوئی جگہ میسر نہ تھی۔ ہم بھوک سے نڈھال تھے، لیکن شام کو ہمیں کھانا نہ دیا جاتا تھا۔
خیر تو میں نے اپنے چیتھڑے الگ کیے ان کو اپنی کھاٹ پر پھینکا اور کہا "یہ حرامی ہم سے روزانہ چار کیوبک میٹر کھدائی چاہتے ہیں، لیکن صرف ایک کیوبک میٹر ہی میں ہم میں سے ایک آسانی سے توپ دم ہو سکتا ہے۔" میں نے صرف اتنا ہی کہا تھا۔ لیکن ہم ہی میں سے ایک ذلیل کتے نے جا کر کیمپ کمانڈر سے میری چغلی کر دی۔
"کیمپ کمانڈر مو کیسر نام کا ایک جرمن تھا۔ درمیانہ قد، گٹھا ہوا جسم۔ چہرے سفیدی مائل بال۔ اس کے سر کے بال پلکیں، آنکھیں تک بھی موٹی سی تھیں۔ آنکھوں کے ڈھیلے ابلے پڑتے تھے۔ روسی فراٹے سے بولتا تھا، بلکہ اس کا لہجہ تک والگا کے علاقے کا سا تھا۔ ادھر کا باشندہ ہو اور گالیاں کیسی فرمائشی دیتا تھا۔ آدمی تھا کہ شیطان کا چرخہ، جانے اتنی شیطنیت اس نے کہاں سے حاصل کی، وہ ہمیں ایک قطار میں کھڑا کر دیتا اور اپنے ہاتھ

پیچھے کمر پر باندھ کر اپنے ایس ایس افسروں کے جھگڑے میں کھڑا سامنے آتا۔ وہ اپنے چمڑے کے دستانوں کے نیچے لوہے کی ایک پتر چڑھائے رہتا تھا۔ تاکہ انگلیاں محفوظ رہیں۔ قطار کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ ہر دوسرے قیدی کی ناک پر ایسا گھونسا جماتا کہ نکسیر پھوٹ پڑتی۔ وہ اسے انفلوئنزا کے لیے انجکشن کہتا تھا۔ روزانہ یہی ہوتا۔ کیمپ میں چار بلاک تھے۔ ایک روز وہ ایک بلاک کو انفلوئنزا کا انجکشن دیتا۔ دوسرے روز دوسرے بلاک کو۔ ناغہ کبھی نہ کرتا۔ لیکن ایک بات اس الو کے پٹھے کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اپنا چکر لگانے سے پہلے اپنا پارہ حد سے زیادہ اونچا چڑھانے کے لیے وہ قیدیوں کی ایک قطار کے سامنے کھڑے ہو کر گالیاں دینی شروع کر دیتا۔ اور ان گالیوں کا اثر پتہ ہے کیا ہوتا؟ ہم لوگ ذرا شگفتہ ہو جاتے! کیونکہ اس کے الفاظ ایسے لگتے جیسے ہمارے ہی دل سے نکل رہے ہوں۔ اور ذرا ہماری طبیعت ہلکی ہو جاتی اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ اس کی گالیوں سے ہم لوگ بہل جاتے ہیں تو وہ شاید روسی میں گالیاں نہ دیتا۔ بلکہ اپنی ہی زبان میں بکتا رہتا۔ ہم میں سے صرف ایک ماسکو کے پرانے یار کو اس پر تاؤ آجاتا تھا۔"......

جب یہ اس طرح گالیاں دیتا ہے تو میں آنکھیں بند کر کے سوچتا ہوں کہ ماسکو میں ہوں اور شراب خانے میں بیٹھا ایک گلاس چڑھا رہا ہوں،

اور مجھے بئیر کے ایک گلاس کی آرزو میں چکر سا آجاتا ہے۔

خیر تو جس دن میں نے کیوبک میٹر والی بات کہی تھی۔ اس کے دوسرے روز کمانڈنٹ نے میرا دھوبی گھاٹ کر دیا۔ شام کو ایک ترجمان اور دو پہرے دار میرے پاس آئے۔

"سولوکوف اندرے! ۔۔۔۔ باہر نکلو۔ کوئیک مارچ۔ کمانڈر صاحب تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"میں سمجھ گیا کہ کمانڈر صاحب کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔ سو میں نے اپنے دوستوں کو الوداع کہا۔ ان سب کو معلوم تھا کہ میں اپنی موت کی طرف جا رہا ہوں۔ پھر میں نے ایک گہرا سانس لیا اور پہرے داروں سے پیچھے ہو گیا۔ کیمپ کا صحن پار کرتے ہوئے میں نے نظر اٹھا کر ستاروں کو دیکھا۔ اور ان کو بھی الوداع کہا اور سوچا "اندرے تم ہر ممکن تکلیف جھیل چکے ہو۔۔۔۔ اندر سولوکوف نمبر ۳۳۱۔۔۔۔

۔۔۔" مجھے ایرینا اور بچوں پہ ترس آیا۔ پھر میں نے ان کا خیال چھوڑ کر پستول کی گولی سے چھلنی ہونے والے سپاہی کی طرح ہمت باندھی تاکہ دشمن یہ نہ دیکھ سکیں کہ زندگی سے جدا ہونا میرے لیے کتنا مشکل ہو گا۔

کمانڈنٹ کے کمرے کی کھڑکی میں پھول سجے تھے۔ ہمارے کلبوں کی طرح صاف ستھری جگہ تھی۔ ایک میز کے گرد کیمپ کے سارے افسر

بیٹھے تھے اور سؤر کی چربی ٹھونسنے میں مشغول تھے۔ میز پر شراب کی بڑی سی بوتل کھلی رکھی تھی اور ڈھیر ساری روٹی، سؤر کی چربی، سیب اور ہر قسم کے کھانے۔ میں نے ان چیزوں پر نظر ڈالی یقین جانو میرا جی متلا اٹھا، اور تقریباً الٹی آ گئی۔ میں بھوک سے مرا جا رہا تھا اور اس وقت تک بھول چکا تھا کہ انسانوں کے کھانے کس قسم کے ہوتے ہیں اور اب یہ ساری نعمتیں میرے سامنے چنی تھیں۔ کسی نہ کسی طرح میں نے اپنی متلی پر قابو پایا اور بڑی ہمت سے نظریں میز کی طرف سے ہٹا لیں۔

میرے بالکل سامنے موکیمر ڈنا بیٹھا تھا۔ اسے چڑھی ہوئی تھی اور پستول سے کھیل رہا تھا۔ سؤر کا بچہ ٹکٹکی باندھے وہ مجھے دیکھتا گیا۔ خیر میں اٹینشن کھڑا ہو گیا۔ اپنی شکستہ ایڑیاں جوڑ کر ایک دوسرے سے ٹکرائیں اور اونچی آواز میں رپورٹ کی ..... "جنگی قیدی آندرئے سوکولوف حاضر ہے۔" اور اس نے مجھ سے کہا، "ہوں روسی ایوان، چار کیوبک میٹر سے جان نکلتی ہے۔ کیوں؟"

"جی ہاں کمانڈنٹ صاحب۔" "اور ایک کیوبک میٹر تمہاری قبر کے لیے کافی ہے؟" "جی ہاں کمانڈنٹ صاحب کافی سے زیادہ ہے۔"

وہ کھڑا ہو کر بولا: "میں تمہاری بہت خاطر کرنے والا ہوں۔ ان الفاظ کی سزا میں میں بہ نفس نفیس تم کو گولی مار دوں گا۔ یہاں بہت گندگی پھیلے گی، اس لیے آؤ باہر چلتے ہیں۔" "جو آپ کی مرضی۔" میں

نے جواب دیا۔ وہ منٹ بھر کھڑا سوچتا رہا، پستول میز پر پھینک کر گلاس شراب سے بھرا ڈبل روٹی کا ٹکڑا اٹھا کر اس پر چربی پھیلائی اور یہ سب چیزیں میرے سامنے کرکے بولا: "مرنے سے پہلے روسی ایوان، جرمن ہتھیارو ں کی جیت کا جام پی جاؤ ۔۔۔۔۔۔۔"

میں گلاس اور روٹی اس کے ہاتھ سے لینے ہی والا تھا، جب میں نے اس کے الفاظ سنے تو جیسے میرے اندر کوئی چیز جلنے لگی۔ میں ایک روسی سپاہی جرمن ہتھیاروں کی فتح کا جام پیوں؟ اس کے بعد اور کیا حکم دو گے کمانڈر کے بچے، جہنم میں جائے تمہاری شراب۔" میں نے گلاس اور روٹی میز پر رکھ دی اور بولا "آپ کی مہربانی اور میزبانی کا شکریہ، لیکن میں شراب نہیں پیتا۔"

وہ مسکرایا۔ "تو ہماری جیت کا جام نہیں پیو گے تم؟" "میری موت اور ساری تکلیفوں سے چھٹکارا؟!" میں نے کہا اور گلاس غٹاغٹ چڑھا گیا۔ لیکن ڈبل روٹی کو میں نے ہاتھ نہ لگایا بڑی شائستگی سے میں نے ہاتھوں سے ہونٹ پونچھے اور کہا "میزبانی کا شکریہ۔ اب میں تیار ہوں، میرا قصہ پاک کیجیے۔"

"لیکن وہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ مرنے سے پہلے ایک لقمہ تو کھالو۔ اس نے کہا۔ پر میں نے کہا۔ "میں پہلے گلاس کے بعد کبھی نہیں کھاتا" سو اس نے دوسرا گلاس بھر کے مجھے تھمایا۔ میں وہ بھی چڑھا گیا۔ مگر روٹی نہیں چھوئی۔ میں نے اپنی ہمت پر سارا داؤ لگا دیا تھا۔ سمجھے میرے بھائی؟ خیر

تو میں نے سوچا صحن میں جا کر گولی کا نشانہ بننے سے پہلے میں نشے میں دُھت ہو چکا ہوں گا۔ کمانڈنٹ نے اپنی سفید بھنویں اوپر اٹھائیں کھاتے کیوں نہیں؟ روسی ایوان، شرماؤ مت۔" لیکن میں اپنی جگہ ڈٹا رہا۔" معاف کیجیے کمانڈنٹ صاحب میں دوسرے گلاس کے بعد بھی نہیں کھاتا۔" اس نے گال پھیلا لیے پھر زور کا قہقہہ لگایا اور ہنستے ہنستے تیزی سے جرمن میں کچھ کہا، شاید میرے الفاظ ترجمہ کر کے اپنے ساتھیوں کو سنائے۔ وہ لوگ بھی ہنسے، کرسیاں پیچھے سرکائیں، اور اپنے اپنے شراب کے پیگ میری طرف موڑ کر مجھے دیکھا۔ اور ان کی نظروں میں مجھے کچھ تبدیلیاں سی دکھائی دیں۔

کمانڈنٹ نے تیسرا گلاس بھر دیا۔ اس کے ہاتھ قہقہے کی وجہ سے لرز رہے تھے۔ میں نے گلاس آہستہ آہستہ ختم کیا، روٹی کا ایک ٹکڑا توڑا اور باقی میز پر رکھ دی۔ میں ان حرامیوں کو دکھانا چاہتا تھا کہ گو میں بھوک سے مر رہا تھا، پر جو ٹکڑے انہوں نے میری طرف پھینکے تھے، میں ان سے اپنے پیٹ کی آگ ہرگز نہ بجھاؤں گا۔ میرے قومی وقار اور غرور نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ اپنی آرزو کے مطابق وہ مجھے ایک جانور میں تبدیل نہیں کر سکے تھے۔

اس کے بعد کمانڈنٹ کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔ اس نے اپنے سینے پر لگے ہوئے آئرن کراس کے دونوں تمغے سیدھے کئے، پستول کے

بغیر میز کے پیچھے سے نکل کر سامنے آیا اور بولا ..... "دیکھو سو کولوف، تم واقعی ایک سپے، اصلی روسی سپاہی ہو، اور مَیں ایک بہادر دشمن کی عزت کرتا ہوں، مَیں تم کو گولی نہیں ماروں گا، آج ہماری دلاور فوجیں والگا کے کنارے پہنچ چکی ہیں، اور اسٹالن پر مکمل قبضہ کیا جاچکا ہے ہمارے لیے یہ بڑی خوشی کا موقعہ ہے، اور اس لیے میں کمال مہربانی سے تمہاری جان بخشی کرتا ہوں، اپنے بلاک واپس جاؤ اور اپنی بہادری کے صلے میں یہ لیتے جاؤ ..... " اس نے ایک چھوٹی سی ڈبل روٹی اور سؤر کی چربی کا ٹکڑا تھما دیا۔

میں نے بے حد مضبوطی سے ڈبل روٹی اپنے سینے سے لگائی، اور گوشت بائیں ہاتھ میں پکڑ لیا۔ میں حالات کی اس اچانک کایا پلٹ سے اس قدر بوکھلا چکا تھا کہ میں نے شکریہ بھی ادا نہیں کیا، واپس پلٹا اور دروازے کی طرف گیا، اور پورے وقت میں سوچتا رہا، اب وہ پیچھے سے مجھے گولی مار دے گا، اور میں یہ روٹی اپنے ساتھیوں کو نہ پہنچا سکوں گا، لیکن کچھ نہیں ہوا، موت ایک بار پھر میرے پاس سے ہو کر نکل گئی، اور میں نے اس دفعہ بھی صرف اس کی ٹھنڈی سانس ہی محسوس کی۔

میں مضبوط قدموں سے کمانڈر کے کمرے سے نکلا لیکن باہر جاکر سارے میں لڑکھڑاتا رہا، پشتم پشتم جھونپڑے میں جاکر وہم سے سیمنٹ کے فرش

پر گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔

لڑکوں نے مجھے منہ اندھیرے ہی جگا دیا، اور پوچھنے لگے۔۔۔۔۔ "بتاؤ ۔۔۔۔۔ کیا ہوا ۔۔۔۔۔ جلدی بتاؤ؟" تب مجھے کمانڈنٹ کے کمرے کا سارا واقعہ یاد آیا، اور میں نے ان کو اپنی داستان سنائی، "ہم لوگ کھانا کس طرح تقسیم کریں گے؟" اوپر کی کھاٹ پر سے ایک آدمی نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا، "سب برابر برابر کا حصہ بانٹ ہوگا بھائی۔۔۔۔۔" میں نے اس سے کہا، ہم دن نکلنے کے منتظر رہے۔ ایک دھاگے کی مدد سے ڈبل روٹی اور چربی کو کاٹا گیا۔ دیا سلائی کی ڈبیا کے برابر ڈبل روٹی ہم سب کے حصے میں آئی۔ اس کا ایک ذرہ بھی ہم نے ضائع نہیں کیا۔ چربی تو اتنی کم تھی کہ اس سے ہونٹ ہی تر کیے جا سکتے تھے۔ لیکن ہم نے اس کے بھی انصاف سے حصے کر لیے۔

بہت جلد جرمنوں نے ہم میں سے تین سو آدمیوں کو (جن میں ابھی تھوڑا بہت دم باقی تھا) ایک دلدل کا پانی لیجانے کے کام پر لگا دیا۔

محاذ پر ہمارے جوان جرمنی کا تھوڑا سا پلیتھن نکال چکے تھے اور فاشسٹ جنگی قیدیوں کے ساتھ اتنی تحقیر کا برتاؤ نہیں کرتے تھے، اور ایک روز انہوں نے دن کی شفٹ کے سارے مزدوروں کو قطار

میں کھڑا کیا۔ ایک باہر سے آئے ہوئے افسر نے ترجمان کے ذریعے ہم سے
کہا جس نے کسی فوج میں جنگ سے پہلے وڈاٹیور کا کام کیا ہو باہر نکلے۔۔۔۔
قطار سے باہر آئے، جرمنوں نے ہمیں پرُانے
اور اِن پھٹے کو دیئے اور پہننے کے ساتھ پرلسنیڈیم گئے"۔ ہم سب ایک ہو گئے
مجھے تو وت کام کرنا تھا، پرکس بنانے اور دوسری بھی زیادہ کا محکمے کا جرمن
نام تھا۔ میں انجینیروں کے دستے کے جرمن میجر کی روبل ایڈمرل کار کا ڈرائیور
مقرر کیا گیا، یہ میجر بھی ایک زبردست ناشتے سور تھا، ٹھگنا قد، توند چوکور
اور عورتوں کے ایسے۔ سامنے کے کالر کے اوپر تین ٹھوڑیاں اور پیچھے گردن
پر تین موٹے موٹے بل، تول میں ایک ہنڈریڈ ویٹ تو اس گینڈے کی چربی
نکلتی ہے اسٹیم انجن کی طرح ہو نکلتا تھا، جب کھانا ٹھونسنے بیٹھتا تھا۔ تو
۔۔۔ دن بھر ٹھونستا ہی رہتا لقمے پر لقمہ اور ساتھ ساتھ فلاسک میں نکال کر
شراب کی چسکی کبھی کبھی مجھ پر بھی نظر کرم پڑجاتی۔ ہر ٹک پر کار رکوا کر اسور
کے کباب اور پنیر سماٹ کر ٹھونستا، شراب ڈھکوستا اور اگر سودا اچھا ہوتا تو
مجھے بھی ایک آدھ ٹکڑا پھینک دیتا، جیسے میں کتا تھا، اس نے ہاتھ سے
اٹھا کر کوئی چیز مجھے نہیں دی یہ اس کی شان کے خلاف تھا، لیکن بہر حال
کیمپ کی زندگی اور اس زندگی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اور رفتہ
رفتہ میں پھر انسان کی جون میں واپس آگیا، تھوڑا سا میرا وزن بھی بڑھ

گیا۔

دو ہفتے تک میں میجر کو پوٹسڈم اور برلن کے درمیان لاتا لے جاتا رہا۔ پھر اُسے ہماری فوجوں کے مقابلے میں دفاعی تعمیروں کے لیے مورچے پر بھیج دیا گیا۔ اور اس کے بعد میری راتوں کی نیند غائب ہو گئی۔ رات رات بھر میں سوچا کرتا کہ کس طرح بھاگ کر اپنے وطن واپس جا پہنچوں۔

ہم کار میں پوپوتسک کے شہر پہنچے، صبح سویرے۔ دو سال بعد پہلی مرتبہ میں نے اپنی فوج کی توپوں کی گرج سنی اور تم سوچ نہیں سکتے کہ اِس آواز پر کیا کیا میرا دل دھڑکا دوست، جب میں نے شادی سے پہلے ایرینا سے اظہارِ محبت کرنا شروع کیا تو تب بھی میرا دل اس طرح اچھل پچل نہ ہوا تھا۔ قریب اٹھارہ کلومیٹر دور پوپوتسک کے مشرق میں لڑائی جاری تھی۔ شہر کے جرمن سخت چڑچڑے اور پریشان ہو رہے تھے، میرا توندل میجر اور شراب پینے لگا۔ دن بھر وہ کار میں چاروں طرف گھوم کر قلعہ بندیوں کی تعمیر کے متعلق حکم جاری کرتا اور رات کو اکیلا بیٹھ کر نشے پانی میں مگن جاتا۔ وہ اور زیادہ پھول کر کپا ہو گیا اور آنکھوں کے نیچے کی کھال سوج آئی۔

آخر میں نے سوچا کہ اب زیادہ انتظار کی ضرورت نہیں یہ میرا آخری موقع ہے اور میں اکیلا نہیں بھاگوں گا میں بڈھے توندل لوگوں کو ساتھ لے جاؤں گا تاکہ وہاں ہمارے کام آ سکے۔

چند گھنٹوں میں لوہے کا ایک بھاری ٹکڑا مجھے پڑا ملا، میں نے اُسے اٹھا کر ایک چیتھڑا اس پر لپیٹ دیا کہ اگر تو ندل کو اس سے مارنے کی ضرورت پڑی تو خون نہ بہے۔ سڑک پر سے ٹیلی فون کا ایک تار کا ٹکڑا اٹھایا اور سب چیزیں کار کی اگلی سیٹ کے نیچے رکھ دیں، ایک شام جو سپنوں کو الوداع کہنے سے دو روز قبل میں پٹرول پمپ سے لوٹ رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک جرمن افسر نشے میں وحشت دیوار کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا، میں کار اس کے نزدیک لے گیا اسے بمباری سے شکستہ ایک عمارت کے اندر لے گیا، اور اس کی یونیفارم اور ٹوپی اتار لی یہ چیزیں بھی کار کی سیٹ کے نیچے داخل دفتر کر دیں۔ اب میں تیار تھا،

۲۹ رجون کی صبح کو میرے میجر نے کہا کہ میں اسے ترونیتسا کی سمت شہر سے باہر لے چلوں، جہاں پر کچھ پل وغیرہ بنائے جارہے تھے ہم روانہ ہو گئے، وہ پچھلی نشست پر بیٹھا اونگھ رہا تھا، اور کار چلاتے ہوئے میرا دل خوشی سے اچھل رہا تھا، میں کار تیزی سے چلاتا رہا لیکن شہر سے باہر آ کر رفتار کم کر دی پھر کار روکی باہر آ کر چاروں طرف نظر ڈالی، میرے پیچھے بہت دور دو لاریاں آہستہ آہستہ آ رہی تھیں، میں نے لوہے کا ٹکڑا نکالا، دروازہ پورا کھول دیا بڈھا تو ندل پچھلی سیٹ پر بیٹھا اس طرح خراٹے لے رہا تھا جیسے اپنے گھر میں سو رہا ہو، میں نے اس کی بائیں کہنی پر زور سے لوہا دے مارا اس کا سر

اس کے سینے پر اگرامیں نے ..... بکا کرنے کے لیے ایک اور ضرب لگائی۔
لیکن میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا بلکہ میرا ارادہ تھا کہ اسے زندہ ہی ہمراہ لے چلوں اس کے ذریعے ہمارے جوانوں کو بہت سی معلومات حاصل ہو سکتی تھیں چنانچہ پستول اس کی پیٹی سے نکال کر میں نے اپنی جیب میں ٹھونس لیا پھر میں نے ایک بریکٹ پچھلی سیٹ پر جما کر ٹیلی فون کے تار سے میجر صاحب کی گردن باندھ دی اور تار کو بریکٹ سے نتھی کر دیا، تا کہ جب میں کار تیزی سے اڑا لے جاؤں تو میجر موصوف ایک طرف کو نہ لڑھک جائیں پھر نگاہ میں نے جرمن وردی اور ٹوپی پہنی اور کار لے کر سیدھا اس سمت کو ہوا ہو گیا، جدھر گھمسان کے رن سے زمین ہل جا رہی تھی۔

میں دو زمین دوز قلعوں کے قریب سے نکلتا ہوا جرمن مورچے کے پار نکل گیا، سب "مشین گنیں" چلانے والوں کے ایک جھنڈ نے ایک خندق میں سر نکال کر مجھے دیکھا میں نے جان بوجھ کر رفتار کم کر دی تا کہ وہ دیکھ لیں، کہ میرے ساتھ ایک میجر بھی موجود ہے۔ انہوں نے ہاتھ ہلا ہلا کر چلانا شروع کیا کہ میں آگے نہ جاؤں لیکن میں نے ظاہر کیا کہ ان کی بات پلے ہی نہیں پڑی اور اسی میل کی رفتار پر اڑنچھو ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ ان کو اصل واقعے کا احساس ہو اور وہ گولہ باری شروع کریں میں دونوں مورچوں کے درمیان "غیر جانب دار قطعے" میں پہنچ کر خرگوش کی طرح بارود کی زمینی سرنگوں

میں سنے پھلانگتا چلا جارہا تھا۔

جرمن میرے پیچھے سے گولہ باری کر رہے تھے۔ پھر ہمارے جوانوں کو بھی غصہ آگیا، اور انہوں نے عین میرے مقابل دھواں دھار گولے چلانے شروع کر دیئے! چار گولیاں موٹر کے اگلے شیشے میں آکر لگیں اور ریڈی ایٹر چھلنی ہو گیا، لیکن کچھ ہی دور پر مجھے ایک جنگل اور جھیل نظر آئی کچھ جوان کار کی طرف دوڑتے ہوئے آئے چنانچہ میں جنگل میں سے زن سے اور آگے نکل گیا، پھر میں زمین پر گر گیا اور میں نے اپنی دھرتی کو چوما، اب میں سانس بھی مشکل سے لے سکتا تھا۔

ایک جوان لڑکا وردی کے کندھے پر خاکی پٹیاں لگائے سب سے پہلے میرے پاس آیا (میں نے وردی پہلے کبھی نہ دیکھی تھی) اور مسکرا کر بولا آہا جرمن شیطان راستہ بھول گیا کیا؟ میں نے اپنی جرمن وردی پھاڑ کر پھینک دی ٹوپی قدموں میں گرا دی اور اس سے کہا: "واہ بیٹا واہ۔ میں جرمن ہوں۔! وورونیژ کے پرانے پاپی۔۔ میں جرمن میں ہوں میں جنگی قیدی تھا، سمجھے میاں صاحب زادے، اور اب اس موٹے سور کی رسیاں کھول، جو کار میں بیٹھا ہے اس کا بستہ اٹھاؤ اور اسے اپنے کمانڈر کے پاس لے جاؤ میں نے اپنا پستول نوجوان کے حوالے کیا، اور ایک کے بعد دوسرے افسر تک ہوتے ہوتے شام

تک ڈویژن کے کرنل کے پاس رپورٹ کرنے کے لئے پہنچ گیا اس وقت تک مجھے کھانا کھلایا گیا تھا، نہا دھو چکا تھا، مختلف سوالات کا جواب دے چکا تھا اور مجھے نئی وردی مِل چکی تھی، سو جب میں کرنل کی خندق میں پہنچا اس وقت صاف ستھرا، مطمئن اور معقول معلوم ہو رہا تھا کرنل اپنے ڈیسک سے اُٹھ میرے پاس آیا اور سارے افسروں کے سامنے مجھے اپنے بازوؤں میں لے کر بولا... شاباش جوان یہ زبردست تحفہ جو تم ہمارے لیے لائے ہو اس کا بہت بہت شکریہ تمہارے میجر اور اس کے بستے کے ذریعے ہمیں وہ کچھ معلوم ہو گیا، جو ہم مورچے پر پکڑے ہوئے بیس جرمنوں کے ذریعے بھی معلوم نہ کر سکتے ہیں تمہارے لیے تمغے کی سفارش کروں گا، اس کے الفاظ اور اس کی محبت کے رویے کی وجہ سے میرے ہونٹ کانپنے لگے اور میں صرف اتنا کہہ سکا... کامریڈ کرنل میں انفنٹری یونٹ میں بھرتی ہونا چاہتا ہوں۔"

لیکن کرنل نے ہنس کر میرے کندھے تھپتھپائے، اس حالت میں کہ تم اپنے پیروں پر مشکل سے کھڑے ہو سکتے ہو ابھی اور اس طرح لڑو گے، تم کو فوراً ہسپتال بھیج رہا ہوں، وہاں تمہاری مرہم پٹی کی جائے گی، تمہیں اچھی طرح کھلایا پلایا جائے گا، پھر تم مہینے بھر کی چھٹی پر اپنے گھر جاؤ گے تمہاری واپسی پر دیکھیں گے کہ تم کو کہاں لگایا جائے۔"

کرنل اور سارے افسروں نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور الوداع کہا اور جب میں باہر نکلا تو میرا سر گھوم رہا تھا کیونکہ پچھلے دو برسوں میں بھول چکا تھا کہ انسان کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا جاتا ہے اور دوست تم کو یہ بھی بتا دوں کہ مجھے بڑے جرمن افسروں سے بات کرتے وقت مکہ پڑتے یا مار کھاتے کے ڈر سے اپنا سر کندھوں میں چھپانے کی عادت پڑ گئی تھی اور یہ عادت وطن پہنچ کر بھی بہت دنوں بعد چھوٹ سکی، اس طرح کی ٹریننگ ہمیں فاشسٹ کیمپوں میں ملی تھی۔"

ہسپتال پہنچتے ہی میں نے ایرینا کو خط لکھا، مختصر لفظوں میں اسے اپنی ساری داستان سنائی، پتہ نہیں بچوں کی طرح میں نے تھوڑی سی شیخی بھی ماری، میں تو یہ تک لکھتے لکھتے رہ گیا کہ کرنل میرے لیے تمغے کی سفارش کرنے والا ہے"۔

دو ہفتے تک بس میں سوتا تھا، اور کھاتا تھا، شروع میں مجھے تھوڑا کھلایا گیا اور تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد، کافی دن گذر گئے لیکن خط کا جواب نہیں آیا اور مجھے فکر ہو گئی، نہ کھانے کو جی چاہتا نہ نیند آتی، قسم قسم کے برے خیال ہولانے لگے تیسرے ہفتے دورنیتر سے چھٹی آئی، لیکن ایرینا کی چھٹی نہیں تھی، ایک پڑوسی نے جواب دیا تھا، خدا دشمن کو بھی ایسا خط نہ پڑھائے، پڑوسی نے لکھا تھا، کہ جرمنوں نے ہوائی جہاز کی فیکٹری پر بم برسائے اور ایک بھاری بم سیدھا میری کاٹج پر آ گرا ایرینا اور لڑکیاں اس وقت گھر ہی پر تھیں ... اب کچھ باقی

نہیں، کالج کی کچھ زمین میں ایک بڑا شگاف پڑ گیا ہے، پہلے تو میں خط پورا نہ پڑھ سکا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا ہو گیا میرا دل ایک چھوٹی سی گینہ۔ کی طرح ایسا سکڑا کہ مجھے لگا کہ اب اس کی حرکت بھی بند ہو جائے گی، پھر پلنگ پر لیٹ کر میں نے اپنے اندر ہمت پیدا کرنے کی کوشش کی اور خط کو آخر تک پڑھ ڈالا پڑوسی نے لکھا تھا کہ میرا بیٹا اناطولی بمباری کے وقت شہر گیا ہوا تھا، شام کو وہ اس جگہ آیا جہاں چند گھنٹے قبل اس کا گھر تھا، اس کھڈ پر نظر ڈالی جہاں بم گرا تھا، اور جہاں پہلے ہمارا گھر تھا، اور اسی رات شہر لوٹ گیا، اس نے میرے پڑوسی سے صرف اتنا کہا کہ وہ فوج میں بھرتی ہونے جا رہا ہے۔"

جب میرے دل کو ذرا سکون ملا اور مجھے لگا جیسے میرے خون کی تیز گردش میرے کانوں تک امنڈ آئی ہے تو مجھے یاد آیا کس طرح ایرینا اسٹیشن پر مجھ سے چمٹ گئی تھی، اس کے دل نے عورت کے دل نے اس سے کہہ دیا تھا اس دنیا میں یہ ہماری آخری ملاقات تھی اور میں نے اسے پرے دھکیل دیا تھا ایک وقت تھا کہ میرا ایک کنبہ تھا، میرا اپنا مکان تھا جو میں نے برسوں کی محنت سے بنایا تھا، اور وہ سب کچھ جنگ میں ختم ہو گیا، اور اب میں اکیلا تھا میری یہ برباد زندگی، یہ سب خواب ہے، خواب ہے۔۔۔ میں نے سوچا، قید کے زمانے میں ہر رات میں نے سرگوشی میں اپنی ایرینا سے اپنے بچوں سے باتیں کی

تھیں، ان کو دلاسا دیا تھا۔ ان سے کہا تھا، کہ جلد گھر لوٹ رہا ہوں روؤ مت ۔۔۔ روؤ مت ۔۔۔ میں ان کو چپکے چپکے سمجھایا کرتا تھا، میں مضبوط ہوں نڈر ہوں، میں سب کچھ سہار سکتا ہوں، ایک دن ہم سب دوبارہ اکٹھے ہوں گے، دو سال تک میں ان لوگوں سے باتیں کر رہا تھا جو مر چکے تھے،

وہ قومی ہیکل انسان چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا، جب اس نے دوبارہ بات شروع کی تو اس کی آواز مرتعش تھی ایک ایک سگریٹ اور پی ڈالی، دوست میرا دم گھٹ رہا ہے ہم نے سگریٹ جلاتے۔ ایک کھٹ کھٹ بڑھئی کی آواز سیلاب زدہ جنگل میں دفعتاً بہت تیز ہو گئی، گرم ہوا بید کی خشک پتیوں میں اب بھی سرسرا رہی تھی، بادل سفید بادبانوں کی طرح اوپر نیلے آسمان میں تیرتے ہوئے گزر رہے تھے، لیکن مکمل اتھاہ خاموشی کے ان لمحات میں جب کہ بے کنار دنیا بہار کی گھمبیر تکمیل کی منتظر تھی، دنیا جو حیات کی ابدی پائندگی کی توثیق کی منتظر تھی! مجھے بہت مختلف معلوم ہوئی خاموش رہنا اتنا اذیت دہ تھا کہ میں نے سوال کیا ۔۔۔ پھر کیا ہوا ۔۔۔؟

پھر کیا ہوا ۔۔۔، داستان گو نے ذرا خلاف مرضی جواب دیا "مجھے کرنل نے ایک مہینے کی چھٹی دی اور ہفتے بھر بعد میں دوردنیتر میں تھا، میں اس جگہ تک پیدل گیا جہاں ایک زمانے میں اپنے کنبے کے ساتھ رہا کرتا تھا، کاٹیج کی جگہ پر اب مٹیالے گدلے پانی سے لبریز ایک بڑا سا کھڈ موجود تھا، چاروں طرف کمر کمر گھاس اُگ آئی تھی، قبرستان کا ایسا سناٹا سارے میں چھایا تھا، میں چپ

چاپ ہکا بکا کچھ دیر وہاں کھڑا رہا پھر اسٹیشن روانہ ہو گیا۔ گھر میں صرف گھنٹہ بھر ٹھہرا تھا۔ اسی روز میں اپنے ڈویژن پہنچ گیا۔

لیکن تین مہینے بعد بادلوں میں سے پھنتے سورج کی طرح مجھے خوشی کی ایک جھلک نظر آئی ۔۔۔ مجھے اناتولی کے متعلق خبر ملی۔ اسے میرے پڑوسی سے میرا پتہ مل گیا تھا۔ اور اس نے دوسرے مورچے سے مجھے خط لکھا ۔۔۔! پہلے وہ ایک کالج میں داخل ہوا جہاں حساب میں اس کی مہارت کی وجہ سے اسے بہت مدد ملی سال بھر بعد وہ اونچے نمبروں سے پاس ہوا اور مورچے پر چلا گیا۔ اور اس نے مجھے لکھا کہ اب وہ کپتان ہے۔ ایک بیٹری کی کمان کر رہا ہے اور جب تک اسے چھ اعزاز اور تمغے مل چکے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ اپنے باپ سے بہت آگے نکل چکا تھا۔ اور میں غرور اور فخر سے پھولا نہ سمایا۔ میرا بیٹا کپتان ۔۔۔! بیٹری کا کمانڈر ۔۔۔!! اتنے سارے تمغے اور اعزازوں کی کیا پرواہ ہے کہ اس کا باپ ایک اسٹیوڈی بیکر پر پھیرے اور گولیاں ہی لادنے پر جُٹا ہوا ہے۔ اس کے باپ کا زمانہ نکل چکا۔ کپتان بیٹے کے سامنے سارا مستقبل ہے۔

اور اب راتوں کو مجھے بوڑھوں کے خواب نظر آنے لگے۔ لڑائی کے بعد میں اپنے دلارے کا بیاہ رچاؤں گا۔ اور بیٹے بہو کے ساتھ رہا کروں گا۔ تھوڑا بہت بڑھئی کا کام کر لیا کروں گا۔ اور پوتے کھلاؤں گا۔ لیکن یہ خواب بھی چکنا چور ہو گئے۔ سردیوں کے موسم میں ہم متواتر آگے بڑھ رہے تھے، اور ایک دوسرے

کو خط لکھنے کا وقت نہ ملتا تھا۔ لیکن جنگ کے خاتمے کے نزدیک جب ہم برلن کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے، میں نے ایک صبح اناتولی کو لکھا اور دوسرے روز ہی اس کا جواب آگیا، معلوم ہوا کہ ایک دوسرے راستے سے وہ بھی برلن پہنچ چکا ہے اور ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب ہی موجود ہیں اس سے ملنے کی بے صبری میں مجھ سے انتظار کی گھڑیاں کاٹے نہ کٹیں۔۔۔۔ اور وہ وقت بھی آگیا۔۔۔ عین ۹ رمئی کو یوم فتح کی صبح ایک جرمن نے کمین گاہ سے گولی چلا کر میرے اناتولی کو ہلاک کر دیا۔

تیسرے پہر کو کمپنی کمانڈر نے مجھے بلا بھیجا، ایک اجنبی آرٹلری افسر اس کے پاس بیٹھا تھا، میں کمرے میں گیا تو وہ اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے میں اس کا اعلےٰ افسر ہوں، میرے کمانڈنگ افسر نے کہا۔۔۔ سوکولوف۔۔۔ یہ تم سے ملنے آئے ہیں۔" اتنا کہہ کر وہ کھڑکی کی طرف مڑ گیا۔ مجھے بجلی کا جھٹکا سا لگا میں سمجھ گیا کہ میں کوئی بری خبر سننے والا ہوں۔۔۔ بابا ہمت سے کام لو۔۔۔ تمہارا بیٹا کیپٹن سوکولوف آج اپنی بیٹری پر لڑتا ہوا مارا گیا، میرے ساتھ آؤ۔"

میں لڑکھڑا گیا، مگر قدم جماتے رہا، جس طرح میں اور وہ لفٹیننٹ کرنل بڑی سی کار میں بیٹھ کر ملبے سے اٹی ہوئی سڑکوں پر سے گزرے وہ منظر مجھے اب بھی خواب کا ایسا معلوم ہوتا ہے، سرخ مخمل سے ڈھکا ہوا تابوت، دونوں طرف سپاہیوں کی قطاریں۔۔۔ یہ بھی ایک دھندلی سی یاد ہے، لیکن میرا اناتولی میری

آنکھوں کے سامنے اس طرح موجود ہے، جیسے اس وقت تم میرے سامنے بیٹھے ہو میرے بھائی میں تابوت کے پاس گیا، میرا بیٹا اس کے اندر لیٹا تھا، لیکن وہ میرا بیٹا نہیں تھا، میرا بچہ تو ہمیشہ ہنستا رہتا تھا، دبلا پتلا، پتلی سی گردن چھوٹے چھوٹے کندھوں والا میرا بچہ ۔۔۔ لیکن یہاں تو ایک چوڑے کندھوں والا، شان دار، خوبصورت مرد میرے سامنے پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں آدھی کھلی تھیں، جیسے مجھ سے پرے، کہیں بہت دور دیکھ رہا ہو۔ اس کے ہونٹوں کے کونوں پر اس کی پرانی مسکراہٹ کی تھوڑی سی جھلک موجود تھی، میرا اناتولی ۔۔۔ میں نے جھک کر اس کا منہ چوما اور پیچھے ہٹ گیا، لفٹنٹ کرنل نے ایک تقریر کی، میرے اناتولی کے دوست اور ساتھی اپنے آنسو پونچھ رہے تھے، مگر میں رو بھی نہ سکا، شاید میرے آنسو میرے دل کے اندر ہی خشک ہو چکے تھے، شاید اسی وجہ سے میرا دل اب بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوتا رہتا ہے۔

میں نے اپنی آخری امید، آخری مسرت کو بھی جرمن دھرتی میں دفن کر دیا، بیٹری نے اپنے کمانڈر کو اس کے آخری سفر پر بھیجنے کے لیے توپوں کی سلامی دی اور اس کے ساتھ ہی میرے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی، جب میں اپنے یونٹ واپس پہنچا تو ایک مختلف انسان بن چکا تھا، اس کے بعد جلد ہی مجھے فوج سے چھٹی مل گئی، اب میں کہاں جاؤں ۔۔۔ وورونیژ ۔۔۔؟ ہرگز نہیں، مجھے ایک دوست کا خیال آیا جو سردیوں میں زخمی ہونے کے بعد فوج سے ریٹائر کر دیا گیا تھا اور

اب اور یو سپنیک میں رہ رہا تھا۔ اس نے ایک دفعہ مجھے اپنے ساتھ رہنے کی دعوت دی تھی، سو میں وہاں چلا گیا۔

میرا دوست اور اس کی بیوی لاولد تھے، اور شہر کے کنارے اپنی ذاتی کاٹیج میں رہتے تھے۔ اسے پنشن ملتی تھی مگر وہ لاری ڈرائیور کا کام بھی کرتا تھا۔ میں بھی وہاں کام کرنے لگا۔ ہم لوگ مضافات میں مختلف سامان ڈھوتے تھے اور خزاں میں اناج ڈھونے کا کام کرتے تھے اور تب میرے ننھے بیٹے سے میری ملاقات ہوئی یہی جو سامنے ریت پر کھیل رہا تھا

لمبے سفر کے بعد آدمی ہمیشہ سیدھا کسی قہوہ خانے میں جا کر کچھ کھاتا ہے اور تھکن دور کرنے کے لیے ووڈکا کا ایک گلاس بھی چڑھا لیتا۔ بری عادت ہے مگر کیا کروں پرانی عادت ہے میری۔ خیر تو ایک روز قہوہ خانے کے قریب میں نے اس بچے کو دیکھا دوسرے روز بھی یہ وہیں موجود تھا۔ مجھے اس پہ اتنا پیار آیا کہ کیا بتاؤں ۔۔۔ چہرہ تربوز کے رس اور مٹی سے سنا ہوا بے حد گندا، سندہ بکھرے بال مگر ایسی چمکیلی آنکھیں جیسے بارش کے بعد آسمان پر ستارے چمکتے ہوں۔ اب اگر وہ مجھے زیادہ دیر تک دکھلائی نہ دیتا تو مجھے دکھ سا ہونے لگتا۔ میں لاری کا کام جلدی جلدی ختم کر کے قہوہ خانے پہنچ جاتا۔ وہیں یہ بچہ اپنی بھوک مٹانے کے لیے پھرتا چکتا رہتا تھا۔ لوگ اسے کچھ کھانے کو دیدیتے تھے۔

چوتھے روز میں اسٹیٹ فارم سے لاری پر اناج لادے لادے سیدھا قہوہ خانے آیا دیکھا، یہ حضرت پیڑ ہیوں پر بیٹھے ٹانگیں چلا رہے تھے، اور کافی بھوکے معلوم ہوتے تھے۔ کھڑکی سے سر نکال کر میں چلایا۔۔۔ "تو ۔۔۔ وائیا ادھر آؤ لاری پر چڑھ جاؤ، تم کو بجلی کے بھوسے کی سیر کرائیں گے، جو اناج اٹھاتا ہے ۔۔۔ پھر واپس آ کر کھانا کھائیں گے ۔۔۔" میری آواز پر بچہ چونک پڑا، پیڑ ہیوں پر سے کود کر لاری کے پائیدان پر چڑھ گیا اور کھڑکی میں اچک کر آہستہ سے پوچھا ۔۔۔ "آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟" اور میرے جواب کے انتظار میں اپنی تارا ایسی آنکھیں پھیلا لیں میں نے کہا کہ "بس میں ان لوگوں میں سے ہوں جو سب کچھ جانتے ہیں"، وہ لاری کے داہنے ہاتھ آ گیا، میں نے دروازہ کھولا اور اسے اپنے پاس بٹھا کر روانہ ہو گیا۔ بڑا چونچوں بچہ تھا، مگر اچانک چپکا ہو رہا۔ اور اپنی لمبی لمبی پلکوں میں سے مجھے دیکھ کر اس نے ایک آہ بھری، اتنا سا بچہ اور ابھی سے اسے آہیں بھی بھرنا پڑ گئیں تھیں "تمہارے ابا کہاں ہیں وائیا؟" میں نے پوچھا "مورچے پر مارے گئے"۔ اس نے ایک مدھم سی آواز میں جواب دیا۔ "اور اماں ۔۔۔؟" "ہم ٹرین میں آ رہے تھے ۔۔۔ گرا اور اماں بھی ماری گئیں"۔ "ٹرین میں کہاں سے آ رہے تھے ۔۔۔؟" "پتہ نہیں یاد نہیں" "اور تمہارے کوئی گھر والے نہیں ہیں ۔۔۔؟" "نہیں ۔۔۔" "رات کو کہاں سوتے ہو؟" "جہاں جگہ مل جائے وہیں سو رہتا ہوں"

میری آنکھوں میں گرم گرم آنسو اُمنڈ آئے اور میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا۔ میں اسے اپنا بیٹا بناؤں گا۔ مجھے بڑا سکون سا محسوس ہوا اور روسی سی مل گئی میں نے اس کی طرف جھک کر پوچھا۔ دانیا تم کو پتہ ہے میں کون ہوں ۔۔۔۔؟" ۔۔۔" کون ۔۔۔؟" میں تمہارا ابا ہوں۔"

" خدایا۔۔۔اس کے بعد ۔۔۔ اِس بچے نے مرے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ میرا منہ چومنے لگا اور چڑیا کی طرح چہک اٹھا " ابا ۔۔۔ ابا ۔۔۔ مجھے پتہ تھا تم مجھے ڈھونڈ نکالو گے میں اتنے دنوں سے انتظار کر رہا ہوں کہ تم مجھے ڈھونڈ نکالو ۔۔۔" وہ مجھ سے لپٹ گیا اور ہوا میں لرزتے گھاس کے ڈنٹھل کی طرح کانپنے لگا۔ میری آنکھوں کے سامنے دھند چھا گئی، میں کانپ رہا تھا میرے ہاتھ بھی کانپ رہے تھے، نہ جانے اس وقت میں لاری کس طرح چلا پایا۔ پھر ایک گڑھے میں گاڑی روک کر میں نے انجن بند کر دیا مجھے ڈر تھا کہ کوئی حادثہ نہ کر بیٹھوں پانچ منٹ تک ہم اسی طرح بیٹھے رہے اور میرا بیٹا چپ چاپ مجھ سے چمٹا اور لرزتا رہا۔ میں نے اسے اپنے دائیں بازو میں سمیٹ لیا نرمی سے پیار کیا اور بائیں ہاتھ سے لاری چلاتے ہوئے اپنے کاٹج آگیا جہاں میں اپنے دوست اور اس کی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔"

لاری پھاٹک پر چھوڑی اپنے ننھے بیٹے کو گود میں اٹھایا اور گھر کے اندر گیا۔ اپنی ننھی ننھی باہیں میری گردن میں ڈال کر وہ سختی سے مجھے لپٹا رہا۔ اپنے

گال میرے کھردرے چہرے سے لگا دیئے اور اس طرح میں اسے گھر کے اندر لے گیا۔ میرا دوست اور اس کی بیوی گھر میں موجود تھے۔ میں نے اندر آکر انہیں زور سے آنکھ ماری اور شگفتگی سے کہا، میں نے اپنے دانیا کا آخر کار کھوج نکال ہی لیا۔۔۔! وہ دونوں خود بے اولاد تھے اور بچے کے لیے ترس گئے تھے فوراً اصل بات سمجھ گئے اور بچے کے لاڈ و پیار میں جٹ گئے، لیکن میں اسے ایک منٹ کے لیے بھی نہ چھوڑ سکتا تھا۔ میں نے صابن سے اس کے ہاتھ دھلائے اور میز کے پاس بٹھا دیا، دوست کی بیوی نے اسے شوربا پلایا، اور جب اُس نے دیکھا کہ بچہ کس بے صبری سے بڑے بڑے گھونٹ نگل رہا ہے تو دپھوٹ پھوٹ کر رونے لگی چولھے کے پاس کھڑے ہو کر اس نے اپنے آنسو پیرن میں چھپانے کی کوشش کی۔ میرا دانیا اس کو روتے دیکھ کر فوراً بھاگ کر اس کے پاس گیا اور اس کی اسکرٹ ننھے ننھے ہاتھوں سے پکڑ کر پوچھنے لگا، خالہ تم کیوں روتی ہو؟ میں ابا کو کیفے کے پاس مل گیا تھا۔ اب تو تم سب کو خوش ہونا چاہیے اور تم رو رہی ہو؟ اس پر وہ غریب اور زیادہ رونے لگی۔

کھانے کے بعد میں نے نائی کے پاس لے جا کر اس کے بال کٹوائے اور گھر لا کر اُسے ٹب میں نہلایا اور صاف چادر میں لپیٹ دیا میرے گلے میں باہیں ڈال کر وہ میری گود میں فوراً سو گیا میں نے اسے آہستہ سے پلنگ پر لٹایا اور کام پر چلا گیا۔ اناج اُتروایا اور سلاری موٹر خانے میں رکھنے کے بعد بازار گیا، سرج کی ایک پتلون ایک

منی سی قمیض، ایک بوڑی چپل اور تنکوں کی ٹوپی خریدی۔ گھر پہنچ کر پتہ چلا کہ سب چیزیں نہ اس کے سائز کی ہیں اور نہ اچھی قسم کی ہیں، میرے دوست کی بیوی نے ڈانٹا۔۔۔ دیوانے ہوئے ہو اس گرمی میں بچے کو سرج کی پتلون پہناؤ گے؟ اور فوراً اس نے اپنی سلائی کی مشین نکال کر میز پر رکھی اور اپنے صندوق میں سے کپڑوں کے ٹکڑے نکال گھنٹے بھر کے اندر اندر میرے دانیال کے لیے سوتی قمیض اور پتلون تیار کر دی۔ رات کو میں نے اسے اپنے ساتھ سلایا اور بہت عرصے بعد چین کی نیند آئی گو رات کو میں چار مرتبہ اٹھ اٹھ بیٹھا، منا میری بغل میں اس طرح پڑا سو رہا تھا جیسے چڑیا اپنے گھونسلے میں سوتی ہو۔ میں تم کو بتا نہیں سکتا کہ میں اس وقت کتنا خوش تھا۔ میں نے اس خیال سے کہ وہ جاگ نہ جائے کروٹ تک نہ بدلی لیکن پھر مجھ سے رہا نہ جاتا، میں چپکے سے اٹھ کر ماچس جلاتا اور اس کی روشنی میں اس کے پیارے پیارے چہرے کو بار بار تکتا،

صبح منہ اندھیرے میں اٹھ بیٹھا، اور سمجھ میں نہ آیا کمرے میں اتنا حبس سا کیوں ہے۔۔۔ تب پتہ چلا کہ میرا منا بیٹا اپنی چادر میں سے نکل کر میرے سینے پر پڑا سو رہا تھا اور اپنا ننھا سا پاؤں اس نے میری گردن میں ٹھونس دیا تھا۔ سوتے میں یہ بچہ مجھے ہمیشہ بہت دق کرتا ہے لیکن اب مجھے اس کی عادت ہو گئی ہے اگر وہ رات کو میرے پاس نہ ہو تو مجھے بے طرح یاد آتا ہے۔ رات کو میں اس کا سوتا ہوا چہرہ اس کے گھنگریالے بال دیکھتا رہتا ہوں۔ اس طرح میرے دل کے اندر جو گھاؤ ہیں

ان کا درد ذرا کم پڑ جاتا ہے، ورنہ میں تو پتھر کا بت بن چلا تھا۔

شروع شروع میں یہ لاری میں میرے ساتھ ساتھ جاتا تھا پھر مجھے خیال آیا کہ یہ بات ٹھیک نہیں اکیلے میں تو مجھے کسی آرام کی ضرورت نہیں دن بھر میں روٹی کا ایک ٹکڑا، پیاز کی ایک گنٹھی اور چٹکی بھر نمک سپاہی آدمی کے لیے کافی ہے لیکن یہ ساتھ ہو تو اس کے لیے دودھ بھی درکار ہے، ایک انڈا بھی ابال لو۔ اور اسے گرم گرم کھانا چاہیے، اور مجھے اپنا کام بھی کرنا ہے سو میں نے ہمت کر کے اسے اپنے دوست کی بیوی کے پاس چھوڑ دیا، پہلے تو دن بھر رویا کرتا اور رات کو اناج تولنے کی جگہ بھاگ آتا وہاں رات گئے تک میری راہ دیکھا کرتا۔

پہلے پہل اس کی وجہ سے مجھے بڑی مصیبت پڑی۔ ایک روز دن بھر کا تھکا ہارا میں اس کے ساتھ بستر پہ جا لیٹا ابھی دن کی روشنی باقی تھی، یوں تو وہ مینا کی طرح چہچہاتا تھا، مگر اس روز خاموش لیٹا رہا۔ "کیا سوچ رہے ہو ننھے۔۔" میں نے اس سے سوال کیا، وہ چھت کو گھورتا رہا "تم نے اپنی چمڑے کی جیکٹ کیا کی ابا۔۔؟"

میں نے ساری عمر چمڑے کی جیکٹ نہیں پہنی تھی ۔۔۔ میں نے بات بنائی ۔۔ "وہ جیکٹ دورونیثر میں رہ گئی بیٹے" ۔۔ "مجھے ڈھونڈ نکالنے میں تم کو اتنی دیر کیوں لگی؟ میں تم کو جرمنی، پولینڈ، بلوروشیا اور نہ جانے کہاں کہاں کھوجتا پھرا اور تم یہاں اور یوپنسک میں آن ملے ۔۔" "اور یوپنسک جرمنی سے قریب ہے ہمارے گھر سے پولینڈ بہت دور ہے؟" اس نے پوچھا۔ اسی طرح باتیں کرتے کرتے

ہم دونوں باپ بیٹوں کو نیند آگئی۔

تمہارا خیال ہے چمڑے کی جیکٹ کے بارے میں پوچھنے کی کوئی وجہ نہیں تھی وجہ یہ تھی کہ یقیناً" اس کا باپ چمڑے کی جیکٹ پہنتا ہو گا اور صرف یہی یاد رہ گیا تھا، بچوں کی یادداشت گرمیوں کی بجلی ایسی ہے بجائی جان بجلی کوندتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے۔

ہم سال بھر اور وہیں رہتے لیکن نومبر میں میرے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا، میں ایک گاؤں کی کیچڑ میں سے لاری لے جا رہا تھا کہ پہیہ پھسل گیا، ایک گائے سامنے آگئی۔ لاری کے دھکے نے اسے سڑک پر گرا دیا۔ گاؤں کی عورتیں ہلّہ کرنے لگیں بھیڑ اکٹھی ہو گئی اور ٹریفک انسپکٹر آن موجود ہوا۔ اس نے میرا لائسنس چھین لیا گائے تو اٹھ کھڑی ہوئی، دُم ہلاتی اور زقند بھر کر سڑک پر بھاگ نکلی میرا لائسنس ضبط ہو گیا جاڑوں بھر میں مستری کا کام کرتا رہا۔ پھر ایک پرانے فوجی دوست نے جو ہمارے ہی ضلع میں ڈرائیور رہے ہے مجھے اپنے پاس بلایا۔ سال بھر تک مستری بنے رہو۔ اگلے سال ہمارے ضلع میں تم کو نیا لائسنس مل جائے گا۔ اس نے کہا، چنانچہ اب ہم اور میرا بیٹا کاشادی جا رہے ہیں۔"

لیکن اگر گائے والا حادثہ بھی نہ ہوا ہوتا تو میں یوکرین چھوڑ دیتا۔ میں ایک جگہ پر زیادہ دنوں ٹک نہیں سکتا جب وانیا ذرا بڑا ہو کر اسکول جانے لگے گا تو میں بھی ایک جگہ پر ٹک جاؤں گا۔ ابھی تو ہم دونوں روس کی دھرتی پر آوارہ

گردی کرتے پھر رہے ہیں۔

"سفر میں بچہ تھک تو نہیں جاتا"، میں نے پوچھا۔

وہ پاؤں پاؤں زیادہ نہیں چلتا زیادہ وقت میری گردن پر چڑھتا ہے، جب اپنی ٹانگیں سیدھی کرنا چاہتا ہے تو میرے کندھے سے کود آتا ہے اور سڑک پر بجری کی طرح اچھلتا کودتا پھرتا ہے، نہیں پریشانی نہیں ہے بھائی جان۔ اصل میں میرے دل کی کوئی چول ڈھیلی ہو گئی ہے، مجھے چاہیے کہ اس کا کوئی کل پرزہ بدلوا ڈالوں۔ بعض مرتبہ دل میں ایسا درد اٹھتا ہے کہ مجھے پتہ نہیں لگتا کہ میں کیا کر رہا ہوں، مجھے ڈر ہے کہ کسی روز سوتے میں مر جاؤں گا تو میرے بچے کو کتنی دہشت ہو گی۔ صرف یہی بات نہیں۔ ہر رات کو میں خواب میں اپنے بیوی بچوں کو دیکھتا ہوں زیادہ تر یا دیکھتا ہوں جیسے میں ہوں اور میں لوہے کے تاروں والی باڑ کے اِدھر موجود ہوں اور سب دوسری طرف آزاد کھڑے ہیں، میں ایرینا اور بچوں سے رَتی رَتی بات کہتا رہتا ہوں لیکن جیسے ہی میں تاروں کا جنگلہ سامنے سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہوں وہ سب غائب ہو جاتے ہیں۔ اور ایک اور عجیب بات ہے، میرے منہ سے کبھی ایک آہ نہیں نکلتی آنکھ سے آنسو کی ایک بوند نہیں ٹپکتی لیکن رات کو جب آنکھ کھل جاتی ہے تو تکیہ بھیگا ہوتا ہے

دریا کی طرف سے میرے دوست کی آواز اور چپو کی چپ شپ، چپ شپ سنائی دی۔ اس اجنبی نے جواب میں کہا میرا گہرا دوست معلوم ہو رہا تھا، اپنا

بڑا سا، لکڑی کے تختے جیسا مضبوط ہاتھ میری جانب بڑھایا اور کہا۔

اچھا اب رخصت بھائی جان۔ خوش رہو۔۔۔ تم بھی خوش رہو دوست کاشاری تک تمہارا سفر خیریت سے کٹے۔"

"شکریہ۔۔۔ بیٹے چلو کشتی پر چلیں۔ اس نے کہا اور بچہ دوڑ کر اس کے پہلو میں آگیا اور اس کے جیکٹ کا کونہ اپنے ہاتھوں میں تھام کے اپنے باپ کے بڑے بڑے قدموں کے ساتھ اپنے ننھے ننھے قدم ملا کر چلنے لگا۔

دو یتیم۔۔۔ جنگ کے ہولناک طوفان کے بکھرائے ہوئے ریت کے دو ذرے جو اجنبی جگہوں پر ڈولتے پھر رہے تھے، کس قسم کا مستقبل ان کے سامنے تھا۔ میں یقین کرنا چاہتا تھا کہ یہ روسی، یہ آہنی عزم اور ارادے کا انسان مستقبل کو بھی جھیل لے گا۔ اور یہ لڑکا اپنے باپ کے پہلو میں بڑا ہو کر ایک ایسا مرد بنے گا جو سب کچھ سہہ سکے جو اپنے ملک کی خاطر بڑی سے بڑی مصیبتوں کا مقابلہ کر سکے۔

ان دونوں کو جاتا دیکھتے ہوئے میرا دل اداس ہو گیا اگر وانیا نہ ہوتا تو شاید ہماری الوداع اتنی غمگین نہ ہوتی کیونکہ چند قدم جا کر وہ اپنے موٹے موٹے گل گوتھنے پیروں پر پلٹا اور اپنا گلاب کی پنکھڑی جیسا ہاتھ ہلا کر اس نے مجھے الوداع کیا۔ اور دفعتاً ایک ملائم سے پنجے نے میرے دل کو دبوچ لیا۔ میں جلدی سے دوسری طرف مڑ گیا۔ یہی یہ عمر رسیدہ لوگ ہیں جن کے

یال جنگ نے سعید کے ہیں نہ صرف سوتے ہیں آنسو بہاتے ہیں بلکہ جاگتے ہیں تو بھی رویا کرتے ہیں۔ اصل چیز ہے کہ صحیح وقت پر اپنا راستہ پکڑ لو۔ اہم چیز یہ ہے کہ اس بچے کا دل نہ دکھاؤ، اس کو یہ نہ دیکھنے دو کہ ایک بے چوڑے آدمی کے گال غیر ارادی طور پر گرم گرم آنسوؤں سے جل رہے ہیں۔

٭ ٭ ٭

[illegible]

یودوکیہ

ویرا پانووا

قرۃ العین حیدر

پیش لفظ

ویرا پانووا ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئیں، انھوں نے چار ناول، متعدد ناولٹ، افسانے اور ڈرامے لکھے ہیں۔ سوویت یونین میں ان کی تصانیف کی مجموعی تعداد ۔ اشاعت پچاس لاکھ ہے۔ ان کی کتابیں تیئس زبانوں میں ترجمہ کی جاچکی ہیں۔ تین ناولوں ۔
"Kruzhilikha" اور "Companions" "The Bright Shore"
کو اسٹیٹ ایوارڈ مل چکا ہے، ان کی ناولٹ "Seryozha" کا فلم بھی بنایا گیا۔ اس فلم نے ۱۹۶۰ء میں کارلووی واری کے فلم فیسٹیول کا سب سے بڑا انعام "Crystal Globe" حاصل کیا۔

"ہماری زندگی ایک رفیع الشان، بڑھتا اور پھیلتا ہوا درخت ہے۔ اسے نمائشی، دکھاوے کے زیوروں سے سجانا حماقت ہے۔ یہ اپنی قدرتی حالت ہی میں بے انتہا شاندار اور خوبصورت ہے۔" ویرا پانووا کے یہ الفاظ یودوکیہ، کی سیدھی سادھی لیکن دلکش کہانی پر خصوصیت سے صادق آتے ہیں۔ ایک روسی

عورت اور اس کے کنبے کی اس نفیس داستان کو قلمبند کرنے کا خیال مصنفہ کو دورانِ جنگ میں آیا تھا۔ لیکن کہانی ۱۹۵۹ء ہی میں مکمل ہو کر شائع ہو سکی۔ "یودوکیہ" ایک ایسی ماں کی کہانی ہے جو پانچ یتیم بچوں پر اپنی ممتا نچھاور کرتی ہے۔ یہ مختصر لیکن پُراثر ناول پڑھنے والوں کے دل میں اتر جائے گا۔

وِیرا پانووا نے ستر سال کی عمر میں اپنے مولد "Rostov-on-Don" میں صحافی کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ جنگ سے ذرا قبل ادب کی طرف متوجہ ہوئیں اور متعدد ڈرامے تصنیف کیے۔ ان کی پہلی کہانی "The Pirozkhovs" جو مزدور خاندان کے بارے میں تھی ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی۔

۱۹۴۴ء کے اواخر میں وِیرا پانووا کو ایک رپورٹر کی حیثیت سے ایک ہاسپٹل ٹرین پر بھیجا گیا اور ۱۹۴۶ء میں ان کی ایک کتاب کی اشاعت نے ان کی باضابطہ ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ اس کتاب میں جس کا عنوان "Companions" یا ساتھی تھا، مصنفہ نے ایک ہاسپٹل ٹرین پر کام کرنے والوں کی تصویر کشی کی تھی جو حیرت انگیز بہادری اور جرأت کے ساتھ زخمیوں کو محاذِ جنگ سے عقب کی سمت لے جاتے تھے۔

اس کے بعد ان کے ناول "Seasons of the Year" "Kruzhilikha" اور ناولٹ "The Bright Shore" اور "Seryozha" شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ وِیرا پانووا نے "Valya" اور "Volodya" کہانیاں اور کئی ڈرامے بھی لکھے۔

ان کی تصانیف تین بار قومی انعام حاصل کر چکی ہیں۔ ۱۹۵۹ء میں انھوں نے اپنے ایک افسانے کو یودوکیہ کے عنوان سے دوبارہ لکھا۔ اس ناول کا فلم بھی بن چکا ہے۔ اس کے علاوہ وِیرا پانووا کی دو اور کہانیاں "Seryozha" اور "Seasons of the Year" بھی پردۂ سیمیں پر منتقل کی جا چکی ہیں۔

یودوکیہ

۱

یُودوکِم چیرِنیشوف لوہار کا دومنزلہ چوبی مکان کیروف اسٹریٹ میں موجود ہے جو پہلے پیرَم اِسکایہ کہلاتی تھی۔ یُودوکِم نے یہ مکان بلیس[۲] سال قبل صرف دو کمروں اور تین کھڑکیوں کے ساتھ تعمیر کرنا شروع کیا تھا۔ بعد میں کونے والے کمرے کا اضافہ ہوا۔ اس میں بھی دریچے تھے، اسی کمرے میں، جس میں ایک جنگی جہاز کا ماڈل دیوار پر آویزاں ہے، آندرے نے اپنی آخری رات اس گھر میں گزاری تھی، اس وقت یہ ساشا کا کمرہ تھا، جو اپنی تعلیم کے لیے ابھی باہر نہیں گیا تھا۔ جب بڑھتے ہوئے کنبے کے لئے یہ مکان ناکافی ثابت ہوا اور نتالیہ اور پاویل اچھا خاصا کمانے لگے تو دوسری منزل بنائی گئی۔ دریچے کے کڑھت والے سفید پردے چیرنیشوف گھرانے کے زنانہ حصے کی کاری گری کا نمونہ ہیں۔ کلَودیہ تک نے، جس کے تیتری ایسے مختصر سے قیام سے تلخ یادیں وابستہ ہیں، خاندانی گشیدہ کاری میں حصہ لیا تھا۔ کھڑکیوں میں چینی گلاب کھِلے ہیں جو سفید پردوں

کے مقابل میں بہت بھلے لگتے ہیں۔ یہ گلاب کاتیہ نے سینچے تھے اور جہاز پر جانے سے قبل اس نے یودوکیہ کو پوری طرح سمجھایا تھا کہ ان کی دیکھ بھال کس طرح کی جائے۔ یودوکیہ کو باغبانی کا زیادہ شوق نہیں لیکن کاتیہ کی خاطر وہ ان پودوں کو کانٹتی چھانٹتی اور سینچتی رہتی ہے۔

گھر کی ہوا جو مخصوص روسی اسٹوو کی وجہ سے گرم رہتی ہے، دھلے ہوئے فرشوں کی صاف ستھری خوشبو، گرما گرم پنیر کے کیک اور گیلری میں لٹکے ہوئے اوورآلوں کے مشینی تیل کی ملی جلی جھکوں سے معمور رہتی ہے۔ نیچی چھتوں والے کمرے صاف شفاف اور دیواریں نیلے فریم والی ان گنت تصاویر سے مزین تھیں۔

"نانی ——— یہ سب تمہارے بچے ہیں؟" ننھی لینا، یودکیہ سے پوچھتی ہے۔

"بالکل۔"

"اتنے سارے"

"اتنے سارے کہاں ہیں، صرف چار ہی تو ہیں۔ آندرے پانچواں تھا۔"

"چار کیسے؟ مجھے تو کم از کم دس یا بیس لڑکیاں دکھائی دے رہی ہیں، لڑکیوں کو تو گنا ہی نہیں۔"

"صرف دو لڑکیاں ہیں۔ خالہ کاتیہ اور تمہاری امی۔"

"اور وہ لڑکی کون ہے چوٹیاں گوندھے؟"

"تمہاری امی۔"

"اور وہ خوبصورت لڑکی ہار پہنے ———؟"

"وہ بھی امی ہیں تمہاری۔"

"اور امی ہی توپ پر بیٹھی ہیں؟" لینا پوچھتی ہے۔ یودوکیہ آہ بھرتی ہے۔

"نہیں وہ خالہ کاتیہ ہیں۔"

لینا آنکھیں بند کر کے کہتی ہے ـــــ "اتنے ڈھیروں بچے ہیں کہ ان کو دیکھتے دیکھتے میں تھک جاتی ہوں۔"

۲

۱۹۲۲ء میں یوُدوکم چیرنیشوف نے طے کیا کہ اب شادی کر ڈالنی چاہیے۔ "کب تک کنوارے گھومتے رہو گے؟ گھر بساؤ اب بیٹے۔" اس کی ماں نے لکھا تھا۔

اب تک اسے شادی کے متعلق سوچنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ بلینی کے گاؤں میں اپنے باپ کی چھوٹی سی لوہار کی دوکان چھوڑ کر وہ یورال کے ایک پُرشور کارخانے میں چلا گیا تھا۔ پھر جنگ آئی، ایک طویل جنگ جو اس کو یورال کے پہاڑوں سے کارپیتھین اور وہاں سے سینٹ پیٹرزبرگ اور وہاں سے ولادی ووستوک لے گئی۔ ہزاروں میل لمبے ریل کے سفر، ہزاروں سڑکیں، چوراہے، گاؤں، ریلوے اسٹیشن، ہسپتال، ریگستان، نہ جانے وہ کہاں کہاں سے گزر گیا تھا۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ دلدلوں میں سے گزرتے ہوئے اسے بخار نے آن دبوچا تھا۔ اس کے پسینے سے شرابور کپڑے اس کی پشت پر خشک ہو گئے تھے اور اس کے ہونٹوں کے آس پاس زخم پڑ گئے تھے۔ ان کٹھن وقتوں میں وہ خشک اور پھٹے ہوئے ہونٹوں کے ذریعے سانس لیتا ایک کھنڈرے سے دوسرے تک پہنچا تھا، بخار میں لرزتا، کیچڑ پر لیٹ کر آسمان کے تاروں کو تکتا تھا اور سوچتا تھا۔ اس کا کیا گھر ہوگا، گرہست کی زندگی کا کیا سُکھ اسے میسّر آئے گا ـــــ کیسی جنت ہوگی وہ ـــــ کہ آدمی تھکا ماندہ گھر لوٹے اور اپنے بھاری

جوتے اتار کر، آرام کا سانس لے ـــ اور بیوی ـــ معقول، پرسکون، رفیق اور مشیر، اور بچے ـــ کتنے پیارے، گول مٹول ـــ

اس کے گھر میں گیارہ بچے تھے۔ اس خیال سے کہ میز پر تیرہ ۱۳ افراد نہ بیٹھیں ان کی ماں نے ان کی نانی کو کوگستان خط بھیجا تھا کہ وہ ان کے ساتھ آن کر رہیں۔ نانی اماں وطن چھوڑنا نہ چاہتی تھیں مگر بیٹی کے نیک شگون کے خاطر ولینی میں آ کر رہی تھیں۔ بھرے پرے گھر میں ہمیشہ رونق رہتی۔ جب سائبیرین گوشت کی پڈنگ برتنوں میں تیار کی جاتی اور آیندہ کے لیے کمرے میں سکھائی جاتی تو سارے گھر میں پڈنگ ہی پڈنگ ہوتی، میزوں پر، بنچوں پر، پلنگوں پر اور کھڑکیوں میں پلمینی کے تھیلے کے تھیلے سرد گیلری میں لٹکتے رہتے۔ میز پر دودھ کی چوڑی بالٹی آتی اور پنیر کے کیک تو گاڑی بھرے لو ـــ

اس طرح کے گھر کا خواب یودوکم دیکھتا تھا۔ طرح طرح کے خواب کہ روپیہ کما کر گھر والوں کے لیے تحفے لا رہا ہے، بچے میز کے گرد بیٹھے ہیں اور ان کی ماں چولہے کے پاس سٹر پٹر میں مصروف ہے ـــ

جنگ کے بعد یودوکم اپنی پرانی فیکٹری میں یورال واپس لوٹ آیا اور ایک دن یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا کہ اس کی مونچھ ذرا قبل از وقت سفید ہو چلی ہے۔ اور آنکھوں کے گرد جھریاں سی پڑ گئی ہیں ـــ جوانی کا زمانہ گیا، اب وہ ایک بھاری بھرکم، قابل اعتماد اور محنتی مرد تھا، جو معمولی باتوں کو اہمیت نہ دیتا تھا۔ برسات میں اس کی ٹانگ کا زخم ہرا ہو جاتا، لیکن بخار سے نجات مل چکی تھی۔ اس گھر بلو جنت کے خواب وہ اب بھی دیکھ رہا تھا۔ چنانچہ اب اس نے لڑکیوں کی طرف نگاہ دوڑائی لیکن کوئی نہ جچی۔ کوئی لفنگی سی تھی، کوئی کم رد، کوئی غیر مہذب۔

"تم کچھ بہت زیادہ بشاش دکھائی نہیں دیتے چیرنیشوف"۔ بوڑھے آندرے

نے ایک روز اس سے کہا "آج شام کو گھر آؤ، ذرا گپ شپ رہے۔"

اودییف کارخانے کے بہترین مستریوں میں سے تھا اور بڑا باوقار اور شائستہ۔ یوُدوکم اپنے بہترین کپڑے ڈانٹ اس کے گھر جا پہنچا۔

اودییف کی بیٹی یوُدوکیہ نے کھانا کھلایا۔ کیونکہ اودییف کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس لڑکی کے مہتابی چہرے پر برابر مسکراہٹ رقصاں رہی۔ اس کی ملائی ایسی جلد، ذرا بڑے دہانے، رخسار کی اونچی ہڈیوں اور باریک ابروؤں کو دیکھ کر یوُدوکم کو گوتم بدھ کے مجسمے کا پُر اسرار لیکن دلکش چہرہ یاد آ گیا جو اس نے ایک بار دلاری دستوک میں دیکھا تھا۔

لڑکی نے ساری شام بات ہی کرنے نہیں دی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ دونوں آدمیوں کو تنہا چھوڑ کر چلی جاتی اور واپس آ کر اس کے سڈول بازو بڑی مہارت سے میز پر گردش کرتے۔ یوُدوکم سارے وقت میزبان سے باتیں کرتا اور لڑکی سے نظریں بچاتا رہا۔ یوُدوکم اور یوُدوکیہ۔ کیا عجیب حسنِ اتفاق تھا! تقدیر؟

اس وقت تک کہ وہ باپ کی دوکان پر کام سیکھا کیا۔ جرمنوں اور سفید روسیوں کے خلاف لڑا۔ بخار میں ہلہلاتے ہوئے دلدلوں میں کروٹیں بدلتا رہا۔ اس دوران میں یہ اجنبی لڑکی اس جنگل میں چھپے ہوئے پھول کی طرح بڑی ہو رہی تھی جو سڑک کے موڑ پر سے اچانک نظر آ جائے۔

اس شام کے بعد سے وہ لڑکی اس کے خیالوں میں آن بسی۔ وہ اس کے گھر جاتا رہا لیکن شرمیلے پن کی وجہ سے اس کو نظر بھر کر دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ رات کو وہ اس کے خوابوں میں آتی، نرم، گرم، گداز۔

یوُدوکیہ گھر کا سارا کام خود کرتی تھی۔ اس کے سگھڑاپے نے یوُدوکم کو اور

زیادہ لٹو کر دیا، مگر اسے ڈر تھا کہ شاید وہ اسے قبول نہ کرے، اور شاید اس کا باپ اس شادی کے خلاف ہو۔

ایک شام وہ اُو دیف کے گھر پہنچا تو یودوکیہ نے مسکراتے ہوئے کہا:

"بابا باہر گئے ہیں، آپ سے انتظار کرنے کو کہہ گئے ہیں۔" یودوکم نشست کے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا اور ٹوپی گھٹنوں پر رکھ لی، اس کے سامنے دیوار پر فاختہ تھامے ایک لڑکی کی تصویر آویزاں تھی۔ وہ تصویر کو بے حد انہماک سے دیکھتا رہا اور کان یودوکیہ کی قدموں کی چاپ پر لگے رہے جو باورچی خانے میں جا چکی تھی۔ پھر وہ کمرے میں آ کر اس کی کرسی کے پیچھے ٹھٹک گئی۔ یودوکم نے سر نیہوڑائے بغیر فاختاؤں والی لڑکی کا مطالعہ جاری رکھا۔ دنیا بالکل تھم کر رہ گئی، مکمل سناٹے میں صرف گھڑی کی ٹک ٹک اور یودوکیہ کی سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یودوکیہ نے ایک آہ سی بھری اور اس کی ہتھیلی نے یودوکم کی گردن کی پشت کو چھوا۔

"اوہ —" اس نے سرگوشی میں کہا۔

یودوکم نے پلٹ کر لڑکی کو اپنے سے لپٹا لیا، ٹوپی فرش پر جا گری، دروازہ کھلا اور میاں اودیف اندر داخل ہوئے۔

"خوب ابا کی غیر موجودگی میں یہ گل کھل رہے ہیں۔ خیر کم از کم یہ لڑکا اوباش یا خرآبح تو نہیں ہے۔ شراب کبھی نہیں پیتا، خیر، خیر، لڑکیاں اپنی ہی من مانی کرتی ہیں۔"

دیوار سے عیسیٰؑ اور مریم کی ایک تصویر اتار کر انتہائی خشک اور غیر جذباتی انداز میں اس نے نوجوان جوڑے پر صلیب کا نشان بنایا۔

کھانے کے وقت ووڈکا انڈیلتے ہوئے اودیف نے کہا "زندگی بڑے بڑے تماشے دکھاتی ہے۔ یہ یاد رکھنا یودوکم، ہر طرح کے تماشے دکھاتی ہے زندگی مگر ہمت کبھی نہ ہارنا۔ میں تم کو ایک سو روبل جہیز میں دوں گا اس سے زیادہ دیتا مگر اس وقت ممکن نہیں!"

"بابا شادی کرنے والے ہیں۔" یودوکیہ نے تشریح کی۔

"شادی سے پہلے میں گھر تعمیر کرنا چاہتا ہوں۔" یودوکم نے کہا۔

"ٹھیک ہے، بہت معقول بات ہے۔ تمہارا جام صحت۔" اودیف نے جواب دیا اور ایک گھونٹ میں گلاس چڑھا گیا۔

۳

شہر کی سوویت نے یودوکم کو پیرم اسکایہ اسٹریٹ میں مکان بنانے کی اجازت دے دی۔ فیکٹری نے لکڑی مہیا کی اور اودیف نے جہیز میں سے پچاس روبل پیشگی دے ڈالے۔

یودوکم نے گھر خط لکھا اور اس کے چاروں بھائی بلینی سے اس کا مکان تعمیر کرنے آن پہنچے۔ اودیف چاہتا تھا کہ لڑکی جلد از جلد رخصت ہو جائے تاکہ وہ خود اپنی دلہن لا سکے۔ اس نے لوہے کی چھت سستی خرید وادی، اور کھڑکیوں کی چٹخنیاں اور دروازوں کے ہینڈل خود لگائے، پیسہ کم تھا اور ایک ایک کوپک قیمتی تھا۔ یودوکم اپنے بھائیوں کو ڈانٹتا کہ جلدی کریں، وہ سب سے چھوٹے سرگئی سے لڑ بھی بیٹھا جس نے کام کرنے کے بجائے شہر جا کر آوارہ گردی شروع کر دی تھی۔

بھائیوں کو یودوکیہ پسند آئی۔ "اچھی ہے، بھلی عورت ہے۔" وہ ان کے لئے روز کھانا لے کر آتی اور بڑی شفقت سے ان سے باتیں کرتی۔

جون کا مہینہ آ گیا۔ کام ہو رہا تھا۔ یودوکم دن بھر کارخانے میں کام کرتا اور طویل روشن راتوں میں مکان کی تعمیر پر جٹا رہتا۔ آہنی چولہا اس نے خود تیار کیا

دیگوں کے ڈھکنے ڈھالے، ڈوئیاں اور پلیپے بنائے۔ انگیٹھیاں اور کھونٹیاں تیار کیں اور یوُدوکیہ کے لئے شاہ بلوط کی الماری بنائی۔ وہ بڑا اچھا کاری گر تھا اور چاہتا تو قلعی گر اور ٹین کا کام کرنے والے مستری کا کاروبار اختیار کر سکتا تھا، وہ بیس ۲۰ گھنٹے تک بغیر تھکے لگاتار کام کر سکتا تھا۔ جب یوُدوکیہ پاس کھڑی دیکھتی رہتی اور وہ خود کام کرتا ہوتا ـــ کیا خوش وقت تھا!

دونوں کی محبت دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔ یوُدوکیہ کا سبھاؤ بہت اچھا تھا، نرم روی اور باضابطگی کے ساتھ ساتھ یوُدوکِم کی طرح اس کے ہاتھوں میں بھی گن موجود تھا۔ وہ سراپا محبوبیت تھی اور جب وہ نزدیک کھڑی ہوتی تو یوُدوکِم کے دل میں شعلے سے بھڑکنے لگتے۔

اکثر اکیلے میں وہ اس کو لپٹا لیتا تو یوُدوکیہ گھبرا کر اُسے پرے ہٹا دیتی۔ "کیسی معصوم اور بھولی ہے" ـــ وہ فخر اور محبت کے ساتھ دل میں کہتا۔

آخر کار گھر مکمل ہو گیا۔

نئی بنچیں، میزیں، الماریاں قرینے سے سجا دی گئیں، حالانکہ ابھی ان پر روغن نہیں ہوا تھا۔ یوُدوکیہ کے پروں والے پلنگ پر آٹھ تکیے سجا دیے گئے آٹھواں تکیہ تقریباً چھت کو چھو رہا تھا۔ پلنگ کے پاس یوُدوکیہ کا آہنی حلقوں والا شاہ بلوط کا صندوق رکھا گیا۔ جس کا تالا کھولو تو گھنٹی بجتی تھی۔

شادی کے روز دلہن کے گھر پر مہمانوں نے کھایا پیا اور ہارمونیم کی موسیقی پر ناچے، دلہن کے بال سرخ فیتے سے بندھے تھے، چہرہ تمتما رہا تھا اور فیتوں کے سرے گردن میں گدگدی سی کر رہے تھے، اسے انگور کی شراب کا نشہ چڑھ گیا تھا اور وہ ہاتھ ہلا کر دولہا کو اس طرح پرے ہٹا رہی تھی جیسے وہ کوئی بدتمیز مکھی ہو۔ فوٹو گرافر نے دونوں کی تصویر لی۔ اودیف کی ہونے والی بیوی جو سبز لباس میں ملبوس

اور بہت منحنی تھی، میزبانی کے فرائض انجام دے رہی تھی "بابا اس کے ساتھ عرصہ سے رہ رہے ہیں" یودوکیہ نے کہا۔

ہنگامہ دن بھر اور دوسرے روز صبح تک جاری رہا۔ سڑک پر سے گزرنے والے راہگیر کھڑکیوں میں سے جھانک کر اندر دیکھ لیتے۔ یودوکیہ بیوی کا ہاتھ تھامے بیٹھا رہا۔ اور جب مہمانوں نے نئے جوڑے کا جام صحت پیا تو اس نے یودوکم کے ہونٹ چومے۔ اب وہ اس کی یودوکیہ تھی۔ اب وہ اپنے گھر جائیں گے اور زندگی کے نئے طویل، خوشگوار اور صالح راستے کا آغاز ہوگا جسے ان کی موت ہی ختم کریگی۔

وہ میز پر سے اٹھ کر مہمانوں اور تماشائیوں کی معیت میں سڑک پر گئے جو طلوع سحر سے ذرا قبل بالکل تاریک تھی۔ ہارمونیم کی آواز فضا میں گونجتی رہی، سبز کپڑوں والی عورت ناچتی اچھلتی ان کے آگے آگے چل رہی تھی۔ آخر کار وہ اپنے گھر پہنچ گئے۔ چاروں طرف شاداں و فرحاں لوگوں کا ہجوم تھا۔ طرح طرح کے مذاق کئے جا رہے تھے، جن کے الفاظ یودوکم کی سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ کیونکہ شراب اور جوان گرم خون کی حدت نے اس کو باؤلا سا کر دیا تھا۔ دولہا و دلہن گھر کے اندر داخل ہوئے اور یودوکم نے دروازہ اندر سے مقفل کر لیا۔

مکان پر خاموشی چھا گئی، صبح کی مدھم روشنی ٹھنڈے کمرے کی کھڑکیوں میں سے جھلکنے لگی، کمرہ تازہ پائن کی لکڑی کی مہک سے بھرا ہوا تھا۔ اب وہ تنہا تھے، یودوکیہ اور یودوکم ——— جن کو قسمت نے ایک دوسرے کا ساتھی بنایا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ گہری نیند سو رہی تھی اور وہ تنہائی اور ہتک کے شدید احساس سے مغلوب چت لیٹا تھا۔

۴

یقیناً وہ اسے بے عزت اور خجل کر کے باپ کے گھر بھیج سکتا تھا، وہ باپ سے کہہ سکتا تھا کہ اس کی اولاد دلاری بیٹی اس کے لیے بےکار ہے۔

یہ واقعہ کہ باپ نے مقدس تصاویر کے ذریعہ یودوکم پر کئی بار صلیب کا نشان بنایا تھا۔ اسے ایک چالباز عورت کے ساتھ باندھ کر رکھنے کے لئے ناکافی تھا۔ اس پر کیوں لازم آتا ہے کہ گدھے کی طرح مرتے دم تک اس عورت کی کفالت کرے؟ باپ بیٹی نے اپنے مقصد کے لئے بالکل غلط آدمی چنا۔ اور سوویت نظام میں کوئی کسی مرد اور عورت کو خلاف مرضی ایک ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔

یا پھر وہ معاملہ کو ڈھکا رکھے۔ جس طرح خود اسے اُلو بنایا گیا تھا۔ اس عورت کو گھر ہی میں رکھے۔ لیکن مارے طعنوں تشنوں کے اس کی جان ضیق میں پھنسے اور اس طرح اپنا بدلا چکائے۔ ”کیوں جی — تم کس منہ سے یہ کہہ رہی ہو —؟ تم کہاں کی پارسا ہو —؟ اپنی پرانی عاشقیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے مجھے ناتھ لیا، کہاں گیا تمھارا یار؟ بھاگ نکلا؟ تمھیں پلّے باندھنے کا روادار نہیں ہوا نا؟ ایسی ایسی باتیں کر کے اس کا کلیجہ چھلنی کر دے بس۔

لیکن اس گھر کا کیا ہوگا جس کے خواب اس نے دیکھے تھے؟ جو گھر اس نے ابھی تعمیر کیا تھا؟ وہ پیاری رفیقۂ حیات کہاں گئی جو سپنوں میں آتی تھی؟

اسے میکے بھیج کر وہ اس گھر میں اکیلا رہ سکے گا؟ اور اسے ساتھ رکھ کر کیا وہ اسے نشتر چبھونے کا اہل ہے؟ ایسی گھٹیا باتیں وہ کبھی کر سکتا ہے؟

نہیں یودوکیم ہی اس کی بیوی ہے اب وہ جانتا تھا کہ یہ لڑکی اصلیت

میں کیا ہے — آوارہ —— چالاک، اپنے تبسم سے شکار پھانستے والی۔ عامیانہ دماغ کی مالک۔ پھر بھی وہ اس کی طرف کھنچتا گیا۔ اس کے علاوہ کوئی اور عورت اس کی جگہ نہیں لے سکتی تھی۔

یوُدوکیہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا شوہر اس قدر ملول اور بیچین کیوں ہے۔ اس کی اسی طرح روشن اور مسکراہٹ ویسی ہی تجلی خیز تھی۔ بعض دفعہ یوُدوکم کا دل چاہتا کہ یہ مسکراہٹ نوچ پھینکے مگر فوراً ہی وہ یوُدوکیہ کے لیے تاسف سا محسوس کرنے لگتا۔

ایک روز صبح صبح سنسان سڑک پر پڑوسن ماری یوشکا سے اس کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ اس بی بی کا لمبوترا، سانولا چہرہ اور بے حد سیاہ آنکھیں تھیں۔ اس کے وقار اور تہذیب کے بڑے چرچے تھے اور یہ بھی مشہور تھا کہ اچھے برے شگون بتانے، ٹونے ٹوٹکے کے ذریعے دانت کا درد رفو چکر کرنے اور خوابوں کی تعبیر بتانے میں ید طولیٰ رکھتی ہے۔

یوُدوکم کو روک کر اس نے کہا "ایک بات بتاؤ بھائی یوُدوکم —— کیا احمد ہمیشہ کے لیے چلا گیا؟"

"احمد کون —— ؟" اس نے پوچھا۔ اگر اس سے یہ سوال نہ کیا گیا ہوتا تو وہ اپنی بیوی کے متعلق کبھی کچھ نہ جان سکتا اور اس کے دل کا درد جو سوتے میں اس کا پیچھا نہ چھوڑتا تھا، شاید اتنی دیر میں زائل نہ ہوتا

"احمد کو نہیں جانتے —— ؟"

"بالکل نہیں"

پڑوسن نے آنکھوں کو شال کے کونے سے ڈھک کر جلدی جلدی ساری داستان کہہ سنائی۔

"احمد کریانے کی دوکان میں نوکر تھا۔ وہ اور یُودوکیہ ایک دوسرے پر عاشق تھے۔ یُودوکیہ سولہ سال کی تھی تب سے معاملہ شروع ہوا، باپ کو علم تھا مگر اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ باپ بیٹی ایک دوسرے کے قصّوں میں کوئی روک ٹوک نہیں کرتے تھے۔ پھر یُودوکیہ کو پیٹ ہوگیا، مگر اس کا قصہ ہی پاک کردیا گیا۔ کیا تم کو کچھ بھی نہیں معلوم؟ بڑے شرم کی بات ہے تم جیسا شریف آدمی —— ہاں تو یُودوکیہ نے کوئی تین سال ہوئے جب حمل گرایا۔ مگر عاشقی قائم رہی۔ جب دوکان بند ہوگئی تو احمد شہر سے چلا گیا مگر پھر واپس آیا اور سلسلہ جاری۔ یہ برابر ہوتا رہا۔"

"شادی کیوں نہ کی دونوں نے ——؟" یُودوکم نے جذبات سے عاری آواز میں سوال کیا۔

"کیسے کرتے؟ احمد تاتاری ہے۔ مسلمان —— اور تمھارے سُسرے مذہب کے معاملے میں بڑے کٹر ہیں۔"

"اب کہاں ہے وہ ——؟" "چلا گیا؟"

"جب سے تم نے اس کے گھر جانا شروع کیا، اس سے پہلے ہی اڑنچھو ہوگیا۔" یُودوکم نے سر ہلایا اور کندھے جھکائے بھاری بھاری قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

اس نے سوچا تھا کہ شادی کے بعد شام کو باتیں کیا کریں گے گپ شپ صلاح و مشورے۔ لیکن اب اس کا دل یُودوکیہ سے بات کرنے کو نہیں چاہتا تھا۔ وہ ساری شام تمباکو پیتے یا اخبار پڑھتے گزار دیتا۔ صلاح و مشورے؟ یہ عورت اس سے شادی کرتے وقت کسی اور کو چاہتی تھی۔

اس کے باوجود اسے یُودوکیہ سے محبت تھی۔ وہ اب بھی بالکل ویسی ہی

تھی جیسا شادی سے پہلے اسے دیکھا تھا۔ صاف ستھری، دلکش، پر سکون، گھر بیحد سلیقے سے رکھتی تھی۔ کھانے بے حد عمدہ پکاتی تھی۔ گنگناتی رہتی۔ وہ بیٹھا تمباکو پیتا رہتا اور سارے گھر میں اس کے قدموں اور اس کی سانسوں کی آواز سنتا رہتا، ان آوازوں کے بغیر غالباً وہ زندہ نہ رہ سکتا تھا۔

اپنا دکھ کم کرنے کے لیے اس نے اپنے کارخانے کے ساتھی شیسٹرکن کو گھر لانا شروع کر دیا۔ لوہار چال کی کھٹ کھٹ نے شیسٹرکن کو بہرا کر دیا تھا مگر وہ بڑا بھلا آدمی تھا، اس کا خیال تھا کہ یودوکم کو یودوکیہ جیسی بیوی کے ساتھ بے حد خوش رہنا چاہیے۔

یودوکیہ کو بھی شیسٹرکن کی آمد اچھی لگتی کیونکہ اس کی وجہ سے گھر کے سناٹے میں ذرا کمی آتی۔ یودوکیہ کا خیال تھا کہ اس کا شوہر بہت اچھا آدمی ہے مگر ذرا خشک طبیعت اور ٹھس ضرور ہے۔ وہ بات ہی نہیں کرتا تھا۔ اظہار عشق کرتے وقت بھی چپکا رہتا۔ احمد کا اظہار عشق کتنا مختلف، کیسا طوفانی تھا۔ وہ اسے طرح طرح کے قصے سناتا۔ بچوں کی طرح اسے اپنی گودی میں بٹھا کر اسے اپنی زبان کے عشق و محبت والے الفاظ سکھلاتا۔ اس کی مسکراہٹ، بیحد چمکیلے دانت، سیاہ بھویں، پتلے ہاتھ، دلنشیں انداز ——— احمد کتنا بانکا جوان تھا۔

اٹھارہ مہینے گزر گئے اور رفتہ رفتہ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے عادی ہو گئے۔ لیکن اولاد سے محروم۔ یودوکم کو یاد تھا کہ ماری یوشکا نے گول گول الفاظ میں کیا کہا تھا مگر پھر بھی اسے امید تھی ایک روز وہ باپ بنے گا۔

۵

لیوڈوکیہ اپنے باپ کے گھر بہت کم جاتی۔ تہواروں کے موقعے پر، شوہر کے ہمراہ چلی جاتی، دونوں کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا جاتا مگر لیوڈوکیہ اب اپنے میکے میں خود کو اجنبی محسوس کرتی۔ اس کی سوتیلی ماں بڑی مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ اور بڑی حسد کی نگاہوں سے اسے دیکھتی تھی۔ باپ اس طرح برتاؤ کرتا گویا ڈرتا ہو کہ بیٹی کچھ اور نہ مانگ بیٹھے، لیکن نتالیہ، لیوڈوکیہ کو سب سے زیادہ ہراساں کرتی تھی۔

دس سالہ نتالیہ اس کی سوتیلی ماں کی پہلی شادی کی یادگار تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں، لمبی گردن، دبلی پتلی، تراشیدہ بال، اس کو دیکھ کر کسی بوڑھی عورت کے چڑچڑے اور بدمزاج چہرے کا خیال آتا تھا۔ جب مہمان گھر میں آتے تو نتالیہ دروازے میں کھڑی ہو کر سب کو دیکھا کرتی اور اگر لیوڈوکیہ کی اس سے آنکھیں چار ہوتیں تو لیوڈوکیہ کو اس چھوٹی سی لڑکی کی متنفر نگاہوں کا مقابلہ کرنا پڑتا۔

نتالیہ ایک ایسی بچی تھی جس سے محبت نہیں کی گئی تھی۔

"دوسروں کے بچے اتنے شائستہ ہیں، ایک میری لونڈیا کو دیکھو، بدتمیز، گستاخ، کہیں سے پڑھنا سیکھ بھاگی ہے، مگر مار بھی ڈالو تو نہیں بتائے گی کہ کس نے سکھایا۔ جب دیکھو تھوتھنی سلی ہوئی ہے، تو بڑا چڑھا ہے منہ پر ــــ اور تم نے بلّی کو کیوں مارا ــــ کیوں جی؟"

اور لڑکی استہزا سے جواب دیتی "وہ چوہے کو کیوں تنگ کر رہی تھی؟"

یودوکم کو اس لڑکی پر ترس آتا تھا "اس کی کیا حالت بنا دی ہے - ان لوگوں نے " اس نے گھر لوٹتے وقت اپنی بیوی سے کہا! "ایسی سہمی ہوئی رہتی ہے، تم سے بات کرتے ہوئے ڈرتی ہے - میں نے سر پہ ہاتھ پھیرنا چاہا تو پرے ہٹ گئی، میں نے بسکٹ دیا تو گھبرا گئی کہ کیا کرے اور شکریہ کیسے ادا کرے - بے چاری لڑکی —" پھر اس نے ذرا زخمی آواز میں اضافہ کیا — "بہت سے لوگوں کو بچوں کی تمنا ہوتی ہے مگر تمہارے ماں باپ صرف اپنے میں مگن ہیں۔"

اگر ہمارے بچے ہوتے تو یہ بڑا اچھا باپ ثابت ہوتا - یودوکیہ نے سوچا - ایک احساس جرم نے اسے گھیر لیا اور پرایشچت کے طور پر اس نے اپنے شوہر کو خوش رکھنے کی کوشش کی - اس کے لیے طرح طرح کے مزیدار کھانے پکانے لگی -

ایک دوبار یودوکم کے ساس سسر نتالیہ کو اپنی بیٹی داماد کے گھر بھیج کر آئے مگر وہاں بھی نتالیہ اکل کھری اور بے چین سی رہی اور کھانے کے وقت بھی میز پر منہ پھلائے بیٹھی رہتی

شروع جاڑوں میں اُودیف کو ٹائیفس بخار نے آن دبوچا، اس کی بیوی نے اس کو ہسپتال میں داخل کر دیا - یودوکیہ باپ کو دیکھنے گئی مگر اس کو اندر جانے کی اجازت نہیں ملی -

ایک صبح یودوکیہ جمائیاں لیتے لیتے چولہے کے لئے لکڑیاں کاٹ رہی تھی، ابھی دن بھی نہیں نکلا تھا اور باورچی خانے میں لیمپ جل رہا تھا - یودوکم کام پہ روانہ ہو چکا تھا - اتنے میں دروازہ کھلا اور نتالیہ اندر داخل ہوئی -

اس نے اپنی ماں کی لمبی آستینوں والی صدری اور روسی نمدے کے جوتے پہن رکھے تھے، اس نے دروازہ زور سے بند کیا اور حواس باختہ سی

دہلیز میں ٹھٹھک گئی۔

"کیا ہوا ــــ؟" یودوکیہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

نتالیہ دروازے کی کنڈی اس طرح تھامے کھڑی تھی جیسے ابھی ابھی پھر باہر جانے والی ہو۔ "یودوکم چچا ہیں؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"نہیں۔کیوں؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے اسی طرح سرگوشی کے انداز میں جواب دیا اور اچانک اس کی آنکھوں کی چمک غائب ہو گئی۔ کنڈی ہاتھ سے چھوڑ کر وہ آہستہ سے فرش پر بیٹھ گئی۔ یودوکیہ نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر لڑکی کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی ــــ

"اماں کو ہسپتال لے گئے ہیں، بابا کل رات مر گئے، گھر میں چولہا جلانے کے لئے لکڑی بھی نہیں ہے ــــ میں چچا یودوکم کے پاس آئی ہوں۔"

اس کا دُبلا پتلا سا جسم بخار سے تپ رہا تھا، چند لمحوں بعد وہ بے ہوش ہو گئی۔ یودوکیہ نے اسے ایک صندوق پر بچھی ہوئی بھیڑ کی کھال پر لٹا دیا، اس کی کہنیاں زخمی اور ہنسلی کی ہڈیاں وحشتناک حد تک سوکھی ہوئی تھیں۔ "بیچاری یتیم بچی ــــ" یودوکیہ نے افسوس کے ساتھ سوچا۔

پھر اسے خیال آیا کہ وہ خود بھی تو یتیم ہو گئی ہے۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ باپ بیٹی کو ایک دوسرے سے کوئی خاص محبت نہیں تھی۔ باپ نے اس کی ڈھنگ سے تربیت بھی نہیں کی تھی۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ یودوکیہ اس کی خاطر گھر صاف ستھرا رکھے اور اس کے لئے اچھے اچھے کھانے پکاتی رہے لیکن اس نے یودوکیہ کے ساتھ برا برتاؤ بھی نہیں کیا، اس کے کپڑے لتے، کھانے پینے کا ہمیشہ خیال رکھا، اور جب یودوکیہ کی عشق بازی پریشان کن ثابت ہونے لگی تو اُدویف

نے اس کے لئے اچھا بر تلاش کر دیا۔ اب اسے محسوس ہوا کہ باپ کی موت کی وجہ سے وہ اپنا سہارا اور اپنا محافظ کھو چکی ہے۔ اب اس نے ہچکیاں لے لے کر رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ "ہائے میں تو دنیا میں اکیلی رہ گئی!" اس نے کراہ کر کہا۔

نتالیہ نے اپنی بڑی بڑی، بھیگی بھیگی آنکھیں وا کر کے سوال کیا۔

"چچا یودوکم کہاں ہیں؟"

نتالیہ دن بھر، ہوش اور غنودگی اور سرسام کی کیفیت میں یودوکم کا نام دہراتی رہی، شام ہوتے ہوتے اس نے یودوکیہ کو یودوکم سمجھنا شروع کر دیا، اپنے پتلے ہاتھ سے یودوکیہ کا بازو پکڑ کر اس نے پوچھا۔

"یودوکم چچا تم مجھے اماں کے پاس تو واپس نہیں بھیج دو گے نا؟"

"نہیں بیٹے — ہرگز نہیں —" یودوکیہ نے جواب دیا اور اس بے کس لڑکی کی حالت دیکھ کر اس کا کلیجہ شق ہو گیا۔ "تم کہیں نہ جانا۔ یہیں رہو، گھبراؤ مت۔"

اس کے ٹھیک نویں دن یودوکیہ کی سوتیلی ماں بھی چل بسی۔ یودوکیہ کے صندوق پر چھے ہفتے تک بیمار پڑے رہنے کے بعد نتالیہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دبلی پتلی منحنی سی، مگر اس کے چہرے پر ایک نئی کیفیت تھی جیسے موت کا مقابلہ کر لینے کے بعد اس نے زندگی پر نئی گرفت حاصل کر لی ہو، زندگی کا نیا ولولہ اس میں پیدا ہو گیا۔

اس کے بال بہت چھوٹے کروا دیے گئے تھے، بیماری کے دوران میں اس کا لباس بھی اب اس کے لئے چھوٹا ہو گیا تھا۔ وہ اپنے پرانے کپڑوں میں ملبوس باورچی خانے اور سونے کے کمرے کے درمیان چکر لگایا کرتی اور ہر

چیز کو اس طرح غور سے تکتی گویا پہلی بار دیکھی ہو۔ دریچے میں کھڑی ہو کر سنسان سڑک پر اڑتے ہوئے برف کے گالوں پر نظر ڈالتی اور چپکے چپکے آپ ہی آپ ہنسا کرتی، جب یودوکم اخبارے کر آتا نتالیہ اس پر کندھے جھکا کر، ہونٹ ہلا ہلا کر ردی چھپائی والے سارے صفحات شروع سے آخر تک پڑھ ڈالتی۔

"بیٹی میں تمھارے لئے کتابیں بھی لاؤں گا" ایک روز یودوکم نے کہا۔ کتابیں آگئیں، نتالیہ ان کو بھی گھول کر پی گئی۔ یودوکم اس کی پڑھائی کا امتحان لینا چاہتا تھا مگر اس کے لیے اسے خود یہ کتابیں پڑھنا پڑتیں اور اب وہ اپنے کارخانے کی ٹریڈ یونین کمیٹی کا صدر چنا جا چکا تھا اور مصروف آدمی تھا۔

"اب تم کو اسکول جانا چاہیے" ایک دن اس نے نتالیہ سے کہا۔

"ابھی اتنی تو وہ کمزور ہے، اسکول کیسے جائے گی" یودوکیہ نے بات کاٹی۔ "ذرا سکت آجائے تو اسے کسی درزی کے یہاں لگا دیں گے۔ نتالیہ درزن بنوگی؟"

"نہیں" لڑکی نے تلخ، غصیلی آواز میں جواب دیا۔

نتالیہ جلد ہی صحتیاب ہو گئی۔ یودوکیہ نے اپنی سوتیلی ماں کے کپڑوں کو کانٹ چھانٹ کر اس کے لئے ٹھیک کیا، اور دھیرے دھیرے اسے خانہ داری کے گر سکھانے لگی۔ نتالیہ گھر کے کام دھندے بے دلی سے ختم کرنے کے بعد فوراً اپنی کتابوں کی طرف متوجہ ہو جاتی۔ لیکن اسے کشیدہ کاری کا بہت شوق تھا اور گھنٹوں اپنی سوچ میں ڈوبی کشیدہ کیا کرتی۔ ایک بار یودوکیہ نے اسے گاتے بھی سنا، وہ بہت دھیمی آواز میں گا رہی تھی اور بھولا چہرہ بے حد پرسکون جذبات سے عاری تھا۔ یودوکیہ کا جی بھر آیا۔ جب ایک دن یودوکم نے اس سے کہا۔ "سنو نتالیہ بی بی، مجھے ابا اور یودوکیہ کو اماں کہا کرو، اب تم ہماری بیٹی

ہو ـــ" تو اس نے مدھم آواز میں جواب دیا ـــ " اچھا ـــ"

۶

یودوکم کمروڑی لیخا کے کارخانے سے ہمیشہ ٹرین کے ذریعے گھر لوٹتا تھا، ایک روز وہ شیلسٹر کن کے ساتھ اسٹیشن سے خراماں خراماں واپس آرہا تھا کہ ربسر سکایہ اسٹریٹ کے نکڑ پر سے ایک عورت کی چیخ سنائی دی ـــ

"چور ـــ چور ـــ چور ـــ چور ـــ"

نیم تاریکی میں ایک چھوٹا سا جھکا جھکا سا ہیولیٰ تیر کی طرح ان دونوں کی طرف لپکا، ایک مختصر سا ہجوم اس کے تعاقب میں تھا۔ بالآخر ہجوم نے اس چھوٹے سے لڑکے کو آن لیا اور اسے زمین پر گرا دیا، عمدہ جوتے پہنے اور سگ ماہی کی کھال کے کوٹ میں ملبوس عورت برف سے ڈھکی ہوئی سڑک پر سراسیمگی سے بھاگتی ہوئی مجمع کے پاس پہنچی۔

"ہا چور ـــ" اس عورت نے دہرایا۔

"کیا چرایا ہے اس لونڈے نے؟" کسی نے دریافت کیا۔

"واپس کر دو بھائی۔ چوری کا مال واپس کر دو۔"

"کہاں چھپایا ہے؟"

"کسی اور کے حوالے کر دیا؟"

"چوروں نے ناک میں دم کر رکھا ہے آج کل"

"میرا بٹوہ ـــ میرا بٹوہ ـــ" عورت پھر دہاڑی۔

کسی نے اس پر مطلق دھیان نہ دیا۔ مجمع لڑکے کو چاروں طرف سے

گھیرے اس فکر میں تھا کہ اس کی مرمت کرے۔ یودوکم بھیڑ چیرتا لڑکے کے نزدیک پہنچا اور اسے کھینچ کر باہر نکال لایا۔ "بٹوہ کہاں ہے؟" اس نے دریافت کیا۔

لرزتے ہاتھوں لڑکے نے اپنے دھان پان جسم پر لٹکے ہوئے چیتھڑوں کے اندر سے بٹوہ نکال کر یودوکم کو دے دیا، یودوکم نے بٹوہ عورت کو دکھایا "یہی ہے؟"

"ہاں۔ شکر ہے ——" عورت نے ایک سسکی بھری۔

اتنی سی بات کا بتنگڑ بنادیا۔ حد ہے بھئی، ایسی معمولی چیز کے لئے کیسا ہنگامہ کھڑا کیا ہے محترمہ نے۔" کسی نے اظہار خیال کیا۔ مجمع کی ہمدردی اس لڑکے کے ساتھ ہو چکی تھی" مگر لونڈے بھی تو ایک روبل کی خاطر پھانسی پر چڑھ جائیں گے حرام زادے۔"

"میرے ساتھ چلو میاں صاحبزادے ——" یودوکم نے کہا۔

"مجھے چھوڑ دو —— مجھے چھوڑ دو" لڑکے نے التجا کی، اس کے ہونٹوں اور ٹھوڑی سے خون بہنے لگا تھا اور برف پر ٹپکتے ہوئے سرخ قطروں کو وہ سہم کر دیکھ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے یار ٹھیک ہے، اب چل دو یہاں سے۔" یودوکم نے اسے دلاسا دیا۔ وہ لڑکے کو اپنے گھر لے گیا اور بیوی سے کہا۔" لو یہ ایک مہمان آیا ہے تمھارے یہاں۔ منہ ہاتھ دھوئے تو کچھ کھلا پلا دو۔"

"میں ٹھنڈے پانی سے ہاتھ منہ نہیں دھو سکتا۔" یودوکیہ کو پتیلی میں پانی انڈیلتے دیکھ کر لڑکے نے کہا۔" میرا خون بہت پتلا ہے۔"

"آئے ہائے، اگو تم اتنے نازک ہو، بے چارے۔" یودوکیہ نے تنک کر

جواب دیا مگر ساتھ ہی چلمچی میں گرم پانی بھی ملا دیا۔ لڑکے نے اس احتیاط سے منہ ہاتھ دھویا گویا اپنے رنگ روپ کی طرف سے بے حد فکر مند ہو۔ یودوکیہ نے پیچھے سے جا کر اپنی ایک باہنہ اس کے کندھے پر رکھی اور اس کے چہرے کو اچھی طرح رگڑ رگڑ کر صاف کر ڈالا۔

"اری چھوڑ مجھے بدتمیز ___" لڑکا دہاڑا "مجھے مارے کیوں ڈالتی ہے۔"

دُھل دُھلا کر وہ ایک سنہرے بالوں اور ذہین شکل و صورت کا زرد رَو لڑکا دکھلائی دیا۔ اس کے ایک نتھنے سے اب بھی خون بہہ رہا تھا اور اس نے انگلی سے نتھنے کو دبا رکھا تھا۔

"جوئیں بھری ہوں گی کپڑوں میں" یودوکیہ نے کہا "سارے گھر کا ناس مارو گے" اور اس نے اپنے مرحوم باپ کی پرانی پتلون اور قمیص لڑکے کو پہنا دی۔ یودوکم کے کپڑے اس کے لیے بہت ڈھیلے ہوتے۔

صاف ستھرا ہوا لڑکا میز کے پاس کونے میں سہم کر بیٹھ گیا۔ جب یودوکم نے اسے ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا پیش کیا تو اس نے ٹکڑا جھپٹ کر لے لیا اور بے تابی سے کھانے لگا، اس کے گال سُرخ ہو گئے۔

"خداوندا۔ سُکھ کے لئے کتنی چھوٹی سی چیزیں درکار ہیں" یودوکیہ نے دل میں سوچا، اتنی سی دیر میں بچّے کی جون بدل گئی، انسان لگ رہا ہے" پھر اس نے لڑکے کو گوشت کی جیلی پیش کرتے ہوئے پوچھا۔ "کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"سمارا"۔ لڑکے نے پانچوں انگلیوں کے ذریعے جلدی جلدی کھاتے ہوئے جواب دیا۔

"ماں باپ ہیں؟"

"کال میں مر گئے۔"

"تمھارا نام کیا ہے؟"

"آندرے۔"

رات کو یودوکیہ نے اسے آتش دان پر سُلایا۔ یودوکِم نے کہا وہ سویرے اس کو لاوارث آوارہ بچوں کے سرکاری مرکز پر چھوڑ آئے گا۔

لیکن صبح سویرے لڑکا نتالیہ کی گرم صدری سمیت غائب ہو چکا تھا، اپنے چیتھڑے گدڑے بھی ساتھ لے گیا تھا جو یودوکیہ نے کل شام اس کے جسم سے اتارے تھے۔

"اور لاؤ چوروں اچکوں کو گھیر گھیر کے اپنے ہاں۔" یودوکیہ نے تلملا کر کہا۔

یودوکِم کو غصّہ آ گیا۔ "میں چور اچکے گھیر گھیر کر لاتا ہوں۔ اور تم ـــــ تم نے اپنے سامان کی حفاظت کیوں نہ کی؟ ہونہہ۔"

کوئی دو مہینے بعد، ایک روز جب یودوکیہ ہاٹ سے گھر لوٹی تو اس نے آندرے کو اپنے باورچی خانے میں موجود پایا۔ وہ غلیظ چیتھڑوں میں لپٹا، فرش پر بیٹھ کر گوبھی کا شوربہ پینے میں مشغول تھا۔ نتالیہ قریب کھڑی بڑی متانت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ہلو ـــ" یودوکیہ نے کہا۔ "اب کی بار رات بھر ٹھہرو گے؟"

"میں اب کے سے چوری نہیں کروں گا۔" آندرے نے اپنا گندہ چہرہ اوپر اٹھا کر جواب دیا۔ "تم کہو گی تو تمھارے لئے لکڑیاں بھی چیر دیا کروں گا۔"

"سردی سے ٹھٹھر چکا ہے۔" نتالیہ نے کہا۔ "کسی نے اس کے جوتے پار کر دیئے۔"

آندرے کے گندے، کالے مُنّے مُنّے ننگے پاؤں دیکھ کر ایسا لگا جیسے کسی نے اس کا کلیجہ مسوس دیا ہو۔ وہ ابھی ابھی برفیلی سڑک پر سے اندر آئی تھی اور سموری کوٹ، نمدے کے جوتوں اور اونی شال کے باوجود اس کے دانت بج رہے تھے۔ پھر بھی وہ لڑکے کو ڈانٹے بغیر نہ رہ سکی۔

"اور وہ گرم صدری کیا کی — ؟ چور بازار میں بیچ دی — ؟ جبھی اب ننگے پھر رہے ہو —"

"اماں — رہنے دو — صدری تو گئی ہمیشہ کے لئے تمھارے ڈانٹنے سے واپس تھوڑا ہی مل جائے گی۔ مگر تم اس حالت میں اسے باہر کیسے دھکیل سکتی ہو؟" نتالیہ نے کہا۔

"فرش پر لوٹ مت لگاؤ"۔ یودوکیہ نے شال اتارتے ہوئے ڈانٹنا جاری رکھا: "بلّی کتے فرش پر بیٹھ کر کھاتے ہیں، انسانوں کو میز کرسی پر بیٹھنا چاہیے۔ نتالیہ چلیچی لاؤ۔ میں پانی گرم کرتی ہوں۔ اے پتلے خون والے نازک اندام — چلو اٹھ کر اپنا تھوبڑا صاف کرو۔"

۷

نتالیہ اور آندرے نے اسکول جانا شروع کر دیا۔ یودوکیہ نے خود جا کر ان کے لئے کاپیاں، بستے اور قلم پنسل خریدے۔ نتالیہ محنتی طالب علم تھی اور استانیاں اس کی تعریف کرتیں۔ لیکن آندرے کے لئے ان کی رائے مختلف تھی۔ "کاہل اور بدتمیز ہے۔ اس کو پڑھانا خالہ جی کا گھر نہیں۔"

شام کو جب نتالیہ باورچی خانے میں بیٹھ کر اپنا سبق یاد کرتی تو آندرے اس کو دق کرتا رہتا "سر کھپانے کا فائدہ؟ لونڈیا ہو، بیاہ کر لوگی۔ ڈھیروں بچے ہو جائیں گے۔ یہ سب پڑھا لکھا بھول جائے گا اس وقت۔"

"ہرگز نہیں"۔ نتالیہ جواب دیتی۔

"سب بھول جاؤ گی، جغرافیہ، حساب، سب کچھ ۔"

"میں بیاہ ہی نہیں کروں گی۔"

"اجی خوب کروگی، اتراؤ مت"

"اماں، دیکھو یہ آندرے کا بچہ مجھے تنگ کیے جا رہا ہے۔"

"اب اس کے ساتھ کیا کیا جائے۔" یودوکم نے ایک دن افسوس کے ساتھ کہا، آندرے چوتھی جماعت میں فیل ہو گیا تھا۔ اب وہ ایک چودہ سالہ تیز و طرار لڑکا تھا۔ ہر طرح کے کام کا اسے شوق تھا سوائے پڑھائی کے۔ پانی بھر کے لاتا، لکڑیاں چیرتا، استری گرم کرتا، برتنوں کی صفائی کرتا، یودوکیہ اس کی مدد کے بغیر اب کچھ کر ہی نہ سکتی تھی۔

"میں کارخانے میں کام کروں گا۔" اس نے یودوکم سے کہا "اسکول میں چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ پڑھتے ہوئے سخت کوفت ہوتی ہے۔"

"اگر کارخانے میں بھی تم نے نوابی دکھانی شروع کر دی تو؟"

"نہیں ـــ جم کے کام کروں، تم دیکھ لینا۔"

چند روز بعد یودوکم نے اس سے کہا "شیسٹرکون تم کو اپرنٹس بھرتی کرنے پر راضی ہو گیا ہے، تم اس کے ساتھ کولہو میں کام کروگے۔ مگر خیال رکھو، مجھے فیکٹری میں سب جانتے ہیں، میرے نام کی لاج رکھنا تم میرے بیٹے ہو۔ کامی آدمی کی حیثیت سے بھی اپنی قدر و قیمت ثابت کرو۔"

آندرے نے وعدہ کیا کہ وہ یودوکم کو کبھی شرمندہ نہ ہونے دے گا، اور اس نے اپنی بات پوری کر دکھائی، کارخانے میں اس کی محنت اور ذہانت کے سب معترف ہو گئے۔ اب وہ صبح کو یودوکم کے ساتھ ہی کام پر جاتا، وہ بڑا ہو گیا تھا؛ سگریٹ پینے لگا تھا اور اپنے تیل اور چکنائی سے بھرے کپڑوں پر نازاں تھا۔ جس دن اس نے اپنی پہلی تنخواہ لاکر یودوکیہ کو دی وہ اس قدر مسرور نظر آرہا تھا کہ نتالیہ کو تھوڑی سی اس سے جلن محسوس ہوئی۔

وہ اپنی تعلیم میں تندہی سے منہمک تھی یصوفیہ کو والوسکایہ اور ماری کیوری اس کی آورش تھیں، اب وہ چودہ سالہ سیانی لڑکی تھی۔ اپنے گھنے بالوں کی دو چوٹیاں گوندھ کر زیادہ پختہ نظر آنے کے لئے وہ ان کو اپنے سر پہ منڈھ لیا کرتی۔ اس نے اسکول کی لڑکیوں کے ساتھ ایک تصویر کھینچوائی تھی اور اس تصویر کو دیکھ کر یودوکیہ کو احساس ہوا تھا کہ نتالیہ خاصی خوبصورت ہوتی جارہی تھی۔

۸

بلینی گاؤں سے خط کبھی کبھار ہی آتے تھے، مگر جب بھی آتے ان میں کسی نہ کسی اہم خاندانی واقعے کی خبر موجود ہوتی، کسی عزیز کی شادی یا موت۔ پیدائشیں بر سبیل تذکرہ واقعات میں شامل تھیں۔ کیونکہ یودوکم کے چار بھائیوں اور تین بہنوں کے ہر سال اولاد ہوتی تھی، اور بھائی سرگیئی کی دلہن نے تو دو مرتبہ جڑواں بچوں کو بھی جنم دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود، جب یودوکم کی طرف سے کسی ولادت کی اطلاع گاؤں نہ پہنچتی تو اس کی ماں کو بڑا تعجب ہوتا، دو بار تو اس نے بیٹے کو لکھا بھی ــــ نورِ چشمی! براہِ مہربانی مطلع کرو کہ تمہاری

ضعیف والدہ پوتے کی خوشی منائے یا پوتی کی پیدائش پر خداوند کریم کا شکر ادا کرے ـــــ نیز یہ کہ نوزائیدہ کا نام تم نے کیا رکھا ہے؟ جب کوئی جواب موصول نہ ہوا تو ماں کی طرف سے اس قسم کے خط آنے بند ہو گئے۔ پورے خاندان میں یودوکم ہی لاولد تھا اور خدا جانتا ہے اسے بچوں کا کتنا شوق تھا۔

گرمیوں میں گاؤں سے ایک خط آیا:۔

"ہم تمھیں یہ اطلاع دیتے ہیں کہ تمھارے بڑے بھائی پیوتر نکولائی وچ نے اس جہان فانی سے کوچ کیا، مرحوم نے اپنے پیچھے سات بچے چھوڑے ہیں جن میں سب سے بڑی افروسینیہ ابھی صرف پندرہ سال کی ہے۔ مرحوم کی بیوی انتونینا ایلی نیچنا بھی بیمار رہتی ہے اور حیران ہے کہ ان سات معصوموں کو کس طرح پالے۔ اس سلسلے میں تمھاری رائے درکار ہے تم ہی اب سب سے بڑے بھائی ہو اور شہر میں رہتے ہو۔ سب دنیا کے حالات سے واقف ہو تم ان بچوں کو آسانی سے کسی یتیم خانے میں داخل کرا سکتے ہو، لہٰذا اگر تم دو ایک دن کے لئے یہاں آ سکو تو بہت مناسب ہو گا۔"

تحریر کے لہجے اور انداز سے یودوکم سمجھ گیا کہ خط اس کے چالاک بھائی مرگئی نے لکھا ہے، پھر اسے اپنی بیوہ بھاوج کا خیال آیا جو خاصی پھوہڑ تھی، وہ ان سات یتیموں کی پرورش کس طرح کر سکے گی؟ چار سال قبل وہ گاؤں گیا تھا تو اسے ہر بہن بھائی کے گھر بچوں کی فوج نظر آئی تھی۔ اسے اب یہ بھی یاد نہ تھا کہ ان میں سے مرحوم بھائی کے بچے کون سے ہوں گے! سات بچے

اس کے رشتے دار ان بچوں کو سوویت سرکار کو سونپ دینے پر ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ نئی نئی سوویت حکومت سارے ملک میں بکھرے ہوئے لاوارث آوارہ بچوں کے زبردست مسئلے کو حال ہی میں حل کر پائی تھی اور ان

کے لیے ہر جگہ مرکز قائم کر دیے گئے تھے، لیکن کیا یودوکم کے خاندان والے اتنے غریب تھے کہ اپنے یتیم بھتیجوں کی کفالت نہیں کر سکتے تھے۔ اور ان کو سرکاری یتیم خانے بھیجنے پر تلے بیٹھے تھے۔

یودوکم نے اپنے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ آخر وہ خود بھی تو دو لاوارثوں کی پرورش کر رہا تھا، اور ان کی وجہ سے اس کی زندگی کتنی پُر مسرت بن چکی تھی۔ یودوکیہ بھی لگتا تھا ان بچوں کی وجہ سے خوش تھی، ہاں۔ یودوکیہ بالآخر معقول عورت ثابت ہوئی تھی۔ اس وقت وہ بیٹھی آندرے کی پتلون میں پیوند لگا رہی تھی۔ کوئی اور عورت اس کی جگہ ہوتی تو آندرے کی زندگی اس نے اجیرن کر دی ہوتی اب تک۔ ایک یودوکیہ کو دیکھو۔ لڑکے کے لئے بکری کی کھال کے قیمتی جوتے خرید کر لائی تھی اور دعویٰ یہ کرتی تھی کہ یہ آندرے کی تنخواہ میں سے خریدے ہیں۔ ایسے سفید جھوٹ پر صرف لونڈا ہی یقین کر سکتا تھا۔ اور ایسے بڑھیا جوتوں کی ضرورت کیا تھی؟ تاکہ صاحبزادے ایک دوست کی شادی میں جا سکیں!! اور وہاں ہم چشموں میں سُبکی نہ ہو! کیونکہ بہرحال صاحبزادے، کارخانے کی ٹریڈ یونین کمیٹی کے صدر کے متبنّیٰ فرزند ارجمند جو ٹھہرے!! لڑکا بھی یودوکیہ کو بہت چاہتا تھا، اور اسے اماں کہہ کر پکارتا تھا ہاں۔ یودوکیہ بھلی عورت تھی، خود لاولد تھی اس لیے پرائے بچوں پر جان چھڑکتی تھی۔

مگر پیوتر کے بچے تو پرائے نہ ہوتے، وہ تو یودوکم کا اپنا خون تھے، پورے سات عدد! دو کو تو وہ پال سکتا تھا، آندرے اور نتالیہ تیزی سے جوان ہو رہے تھے۔ آندرے کام سے لگ چکا تھا۔ چنانچہ وہ کل ہی گاؤں جائے گا۔

دوسرے دن وہ چھٹی لے کر گاؤں روانہ ہوگیا۔ پہلے اس نے بیوی کو بھی ساتھ لے جانے کا ارادہ کیا تھا مگر پھر اسے خیال آیا کہ گاؤں کی عورتیں اس کے بانجھ پن کے بارے میں کیا کیا قیاس آرائیاں نہ کریں گی۔ کیسی کیسی کھچڑیاں نہ پکیں گی۔ اور اسے افسوس ہوگا۔

گاؤں بالکل نہیں بدلا تھا۔ ہاں ماں بوڑھی ہوگئی تھی اور اب قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ اس کی آمد پر سارا کنبہ جمع ہوگیا اور اسے بیوہ بھاوج کے گھر لے گئے۔ انتونیدا حسب معمول سر پر آدھی درجن چیتھڑے باندھے، دیور کو دیکھ کر زار و قطار رونے اور بین کرنے لگی۔ شکایتیں، سسکیاں آنسو، اس کی مالی حالت اچھی خاصی تھی، ایک گائے، دو بچھڑے، دو درجن بھیڑیں۔ بھائی پیوتر بڑا محنتی کسان تھا۔ اسی لئے بیمار پڑ کر دوسری دنیا کو سدھارا۔

سارا گھرانہ صبح ہونے تک اکٹھا بیٹھ کر پیوتر کے بچوں کے متعلق بحث و مباحثہ کرتا رہا۔ انتونیدا دو سب سے چھوٹے بچوں اور سب سے بڑی لڑکی کو اپنے پاس رکھنے کے لئے تیار تھی۔ دو بڑے لڑکے ان کی ایک پھوپھی پیلاگیہ نے لے لئے جو گاؤں کے سوویت کی سربراہ تھی۔ اب دو بچے نو سالہ پاویل اور پانچ سالہ کاتیہ باقی بچے۔ یودوکم نے کنبے کو مطلع کیا کہ وہ ان دونوں کو متبنّٰی بنائے گا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے بھائی اس فیصلے سے خوش ہونگے۔ مگر وہ بے دلی سے "ہوں ہاں" کرتے رہے۔ پہلے پہل تو یودوکم کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے بھائیوں نے دفعتاً یہ رویہ کیوں اختیار کر لیا۔ لیکن جب اصلیت اس پر روشن ہوئی تو اسے بے حد غصہ آیا۔ انتونیدا نے کہا تھا کہ وہ ایک بچھیا بچوں کے ساتھ بھیج دے گی۔ اور بھائیوں کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ ایک

جوان گائے ان کے ہاتھ سے نکل جائے۔ یودوکم نے کھڑے ہو کر جھنجھلاہٹ کے ساتھ کہا "مجھے بچھیا کی ضرورت نہیں ہے۔ میری آمدنی کافی ہے کیونکہ سوویت نظام کے تحت مزدور طبقہ اب مظلوم نہیں رہا۔ میرے پاس گائیں اور بھیڑیں نہیں ہیں مگر تم لوگوں سے بہتر اور زیادہ صحتمند زندگی گزارتا ہوں۔ جہنم میں جائے تمھاری بچھیا، میں اپنے مرحوم بھائی کے بچوں کو اس کے بغیر ہی پال سکتا ہوں۔"

شرمندہ ہو کر سارے بھائیوں نے یودوکم سے اصرار کیا کہ وہ بچھیا ضرور بالضرور اپنے ساتھ شہر لے جائے۔ اتنی دیر میں کھانا آگیا۔ انتونیدا نے اپنی بڑی لڑکی افروسینیہ سے کہا کہ تہ خانے میں سے جَو کی خانہ ساز شراب نکال لائے۔ پیوتر کی روح کے ابدی سکون کے نام پر ایک جام کے بعد دوسرا جام چڑھایا گیا اور بہت جلد شراب کا پیپا خالی ہو گیا۔

۹

یودوکیہ پر درماندگی اور دل گرفتگی کا دورہ سا پڑ گیا تھا۔ آندرے بھی تعطیل منانے کے لئے کیمپ جا چکا تھا اور گھر سنسان پڑا تھا۔ گھر کے دونوں مرد پردیس میں تھے۔ شام کے کھانے پر کس کا انتظار ہوتا؟ وہ اور نتالیہ بڑا جھگڑا گرم کرنے کی ضرورت نہ سمجھتیں اور اپنے لئے ٹھنڈا شوربا تیار کر کے سماوار جلاتیں۔ گھر کے پچھواڑے سبزی ترکاری کے چھوٹے سے باغ میں ابھی اتنا کام نہ تھا جو یودوکیہ کو دوپہر تک ہی مصروف رکھتا۔ نتالیہ تو خیر دن بھر اپنی کتابوں میں جٹی رہتی تھی مگر یودوکیہ کیا کرتی؟

اس نے اپنے لیے بہت سے الم غلم ڈھونڈ نکالے۔ موزوں کی رفوگری شروع کی۔ خوب صورت پھولدار سوتی کپڑا خرید لائی اور تکیوں کے غلاف سی ڈالے۔ کام کرتے کرتے جمائی لے کر اکثر اس کا ذہن احمد کی طرف بھٹک جاتا۔ احمد اس کو ہمیشہ کیسا خوش وخرم رکھتا تھا۔ اس کے لئے لاڈ کرتا تھا بے چارہ۔ کاش وہ اس وقت صرف ایک ہفتہ اس کے ساتھ گزار سکتی تاکہ اس کا مذاح اس کے جسم و جان کو ایک بار پھر تر و تازہ کر دے! اس مختصر سی عشرت کے بعد وہ پھر اپنے روز مرّہ کے گھریلو کام کاج کی طرف لوٹ آتی! مگر احمد کا تو کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔

ایک روز یودوکم کا تار آیا۔ اس نے آج تک کوئی تار موصول نہیں کیا تھا اور جب نتالیہ نے اسے بتایا کہ یہ الفاظ تاروں کے ذریعے سفر کر کے اس تک پہنچے ہیں تو اس کا دل فخر سے معمور ہو گیا۔ یودوکم نے اطلاع دی تھی کہ وہ دو بچوں اور ایک بچھیا کے ہمراہ آرہا ہے۔ سب انتظام ٹھیک کر دیا جائے۔ یودوکیہ مسکرا پڑی۔ مزید دو بچے! اس رفتار سے گھر کے سارے تکیے ناکافی ہوں گے۔

نتالیہ کے ساتھ اس نے سارے مکان کا جائزہ لیا اور طے کیا کہ بچوں کے لئے فی الحال دو بنچیں اکٹھی کر کے ان پر بھوسے کا گدا بچھا دیا جائے۔ پلنگ بعد میں خرید اجائے گا۔ بچھیا کے لئے یودوکیہ نے آنگن کا سائبان خالی کر دیا۔ جاڑوں میں بچھیا کے لئے گھر سے ملا ہوا باڑہ تیار کرنا ہو گا۔

یودوکیہ نے کوزنیہ جاکر چارہ خریدنے کا بندوبست کیا۔ اس وقت اس کے پاس پیسے نہ تھے چنانچہ اس نے رقم بعد میں ادا کرنے کے وعدے پر تھوڑے سے پیسے بطور ضمانت رکھا دیئے۔

یودوکم، نئے بچوں اور آندرے کی واپسی کے بعد احمد کے متعلق سوچنے کا وقت اب کس کے پاس تھا۔ بھیا بھی مال گاڑی کے ذریعے آن پہنچی۔

یودوکم کو بچے بہت اچھے لگے۔ لڑکا شکل وصورت اور چال ڈھال میں بالکل یودوکم کی مانند تھا۔ شرارتیں کرنے کے بجائے دن بھر چپکا بیٹھا تصویر بنایا کرتا۔ وہ بہت تیز نظر اور ذہین بچہ تھا۔ ایک روز اس نے یودوکیہ سے پوچھا۔

"چچی۔ نتالیہ اور اندریو شا تم کو اماں کہتے ہیں، ہم اور کاتیہ تمہیں چچی کیوں کہتے ہیں؟"

"یہ دونوں بن ماں کے بچے ہیں اور تمھاری ماں خدا رکھے زندہ ہے، میں تمھاری چچی ہوں۔"

"ہماری امی تو ہمیں اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتیں۔" پاویل نے جواب دیا۔ "صرف افروسینیہ، پارانیہ اور رویتیہ کو چاہتی ہیں۔"

یودوکیہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ اور کہا۔

"اپنی امی کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے کے لئے ابھی تم بہت چھوٹے ہو بیٹے۔"

پاویل خاموش رہا لیکن چند روز بعد اس نے کہا۔ "چچی ہم بھی تمہیں اماں پکاریں گے۔" پھر اس نے اپنی بہن سے کہا۔

"کاتیہ، چچی کو اماں کہا کرو، سنا تم نے"

"کیوں؟"

"کیونکہ ہماری اپنی امی نے ہمیں اپنے ساتھ نہیں رکھا۔"

"ہماری امی بُری ہیں؟"

"ہاں۔ لیکن اپنی امّی کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے کے لئے ابھی تم چھوٹی ہو۔"

"اچھا۔"

سرخ گالوں والی مضبوط اور تندرست کاتیہ کی وجہ سے یودوکیہ کو بہت جھنجھلاہٹ ہوتی۔ وہ اس بچی کو اپنے ہاتھ سے لقمہ بنا کر چمچے سے کھلاتی تو کاتیہ اس کے ہاتھ سے چمچہ چھین لیتی اور چیختی — "میں خود کھاؤں گی۔" یودوکیہ اس کو بالاپوش پہنا کر، بالوں کو ریشمی فیتوں سے سنبھالتی۔ کاتیہ فیتے گنوا دیتی، بالاپوش کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی اور اپنے صاف ستھرے کپڑوں کو پل کی پل میں غلیظ کر کے ہاتھ پاؤں میں کھرونچے لگائے سارے میں پڑی پھرتی۔ یودوکیہ بڑے صبر کے ساتھ اسے پھر نہلاتی دھلاتی اور کہتی "آہا، کیسی پیاری لڑکی خدا نے ہمیں بھیجی ہے۔"

"میں خود نہاؤں گی۔" یودوکیہ کے ہاتھ سے اسفنج چھین کر کاتیہ چلاتی۔

نتالیہ اس چھوٹی سی پود کو ذرا سرپرستی کی نظر سے دیکھتی تھی۔ پاویل، نتالیہ سے بہت مرعوب تھا، وہ کہتا "میں تمہارا پشکن کا مجموعہ دیکھ سکتا ہوں۔"

"ہاں مگر تمہارے پلّے کچھ نہیں پڑے گا۔"

"تمہاری لال اور نیلی پنسل لے سکتا ہوں؟"

"لے لو۔ مگر توڑ مت ڈالنا۔"

ایک مرتبہ نتالیہ نے دیکھا کہ وہ اس نیلی اور سرخ پنسل کے ذریعے پشکن کی ایک کہانی "رُسلان اور لُدمیلا" کی تصویر کشی کرنے میں مصروف تھا، اس نے باغ میں ہلکا نیلا رنگ بھرا تھا جس میں لُدمیلا سرخ شعلے کی طرح کھڑی تھی۔ بے حد انہماک سے سر جھکائے اپنا نچلا ہونٹ دبائے ہوئے

وہ پتیوں میں نیلا رنگ بھر رہا تھا۔ اپنے کندھے کے اوپر سے جھانکتی ہوئی نتالیہ کو اس نے دیکھا۔

"یہ تم نے بنایا ہے؟" نتالیہ نے حیرت سے پوچھا۔

"نتالیہ پر ایک نظر ڈال کر اس نے کرسی میں بے چینی سے پہلو بدلا اور شرما گیا" کیا اتنی خراب ہے یہ تصویر؟" کچھ دیر بعد اس نے دریافت کیا۔ پھر اپنے کارنامے پر نظر ڈالی اور ذرا خود اعتمادی کے ساتھ نتالیہ کو غور سے دیکھا۔

"بہت ہی اچھی ہے" نتالیہ نے خلوص کے ساتھ جواب دیا۔

"تم لے لو ——" پاویل نے تصویر اسے پیش کی۔

"تمہیں رنج تو نہیں ہوگا اسے دینے کے بعد؟"

"ہرگز نہیں۔ میں اور جتنی چاہے تصویریں بنا سکتا ہوں اپنے لیے۔ مگر دقت صرف یہ ہے کہ میرے پاس کاغذ اور رنگین پنسلیں نہیں ہیں"

"تم میری پنسلیں لے لو۔ اور یہ پنسل بھی اپنے پاس ہی رکھو"

آندرے نے انقلاب اکتوبر کی سالگرہ منانے کے لئے گھر میں بجلی کی روشنی لگائی۔ باورچی خانہ اور پلنگ کمرہ اب خوب روشن رہتے۔ پلنگ کمرے میں لالے کی وضع کا بلوری لیمپ شیڈ لگایا گیا' باورچی خانے کے بلب پر دھات کا شیڈ سجا، جس پر سبز روغن کیا گیا تھا۔ بچھیا کے نئے باڑے میں بھی بجلی کی روشنی پہنچا دی گئی۔ لیودوکم نے اپنے کارخانے کے ساتھیوں سے کہا" میرے لڑکے نے بغیر کسی مستری کی مدد کے سارے گھر میں خود بجلی فٹ کی ہے"

"میں اسے اور بھی بہت سے کام سکھاؤں گا" شیسٹرکن نے اونچی

آواز میں کہا: "میری استادی کا معاوضہ جانتے ہو کتنا ہے ۔۔۔؟"

"نہیں ۔ تم ہی بتاؤ۔"

لیکن شیسٹرکن نہ بتا سکا کہ آندرے کو کاری گری سکھانے کے عوض میں کتنی رقم اس کی طرف سے یودوکم پر واجب آتی تھی! آندرے اب تنہا کام کر رہا تھا ۔ پھر بھی دن میں کئی بار شیسٹرکن اس کے پاس جا جا کر اسے کام کے سارے گُر سکھاتا رہتا۔ اتنے ذہین شاگرد سے علیحدگی اسے بہت کھلتی تھی ۔

۷ر نومبر کے جشن میں سارے چیرنیشوف خاندان نے جلوس کے ساتھ مارچ کیا ۔ نتالیہ اپنے اسکول کے ساتھ آئی تھی ۔ آندرے کارخانے کے نوجوان کاری گر کے ہمراہ تھا ۔ اور یودوکیہ اور دونوں چھوٹے بچے یودوکم کے ساتھ تھے ۔ یودوکم نے ننھی کاتیہ کو اپنے کندھے پر چڑھا رکھا تھا ۔

۱۰

کارخانے میں نئی مشین اور ایک زیادہ طاقت ور کولھو لگا دیا گیا ۔ شسٹرکن کو خیال آیا کہ وہ ہاتھ سے کام کرنے والا کاری گر ہے ، مشینوں کی موجودگی میں اب اس کی ضرورت نہیں اور اسے نکال دیا جائے گا ۔ اپنے تفکرات بھلانے کے لئے اس نے بے حد شراب پینی شروع کر دی ۔ لیکن نئے کاری گروں کو کام سکھانے کے لئے اسے کارخانے میں برقرار رکھا گیا اور اس کی تنخواہ بھی بڑھ گئی

"تم تو احمق ہو ، واقعی تمہارا پتا کٹ ہی جانا چاہیئے تھا کیونکہ تم نمبر ایک

کے بے وقوف ہو" یودوکم نے کہا۔" حالانکہ شراب نہ پیو تو خاصے مرد معقول دکھائی دیتے ہو"

"چپ ہو جا بے۔ مرد معقول کا بچہ" یاشینسٹر کن دھاڑا" یہ مشینیں ملک کے لئے مجھ سے زیادہ فائدہ مند ہیں؟ مشینیں خریدی اور بیچی جا سکتی ہیں، لیکن یہ جو میرا کدّو ہے نا میرے کندھوں پر، یہ انمول ہے۔ کیا سمجھے بیٹا"

یودوکم نے مزید ٹریننگ کے لئے ایک کورس میں داخلہ لیا، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ نئے حالات کے تحت نئی مشینوں اور کام کی نئی تعداد کا ساتھ دینے کے لئے ایک اہم مزدور کی حیثیت سے نئی ٹریننگ اس کے لئے بے حد ضروری تھی۔ اب وہ پہلے سے بھی زیادہ مصروف رہنے لگا، لیکن پھر بھی اپنے کنبے کے لئے وقت ضرور نکال لیتا اور ان کی ضروریات کا خیال رکھتا۔ اس نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ اس کا خاندان اتنے مختصر سے مکان میں نہیں رہ سکتا۔

"ہم سے زیادہ جگہ تو ہماری بچھیا کے پاس ہے" اس نے اپنی بیوی سے شکایت کی " آندرے چلو کوٹھے پر ایک کمرہ بنا لیں، بن سکتا ہے؟"

"بالکل"

"اچھا تو نقشہ بناؤ، سیدھا سادہ، مگر عمدہ"

بہت سے مزدور اب سرکاری قرضے پر اپنے اپنے مکان تعمیر کر رہے تھے۔ شینسٹر کن کی مدد کے ساتھ گرمیوں کے زمانے میں کوٹھے پر کمرہ تعمیر ہو گیا۔ اور آندرے اور پاویل اس میں چلے گئے، اب آندرے کے دوست احباب اُس سے ملنے وہاں آیا کرتے۔ سب مل کر گٹار بجاتے، گاتے، یا اخبار کے تازہ مضامین کے متعلق بحث و مباحثے کرتے۔ بعض دفعہ ایسی گرما گرمی ہوتی کہ مار پیٹ کی نوبت آتے آتے رہ جاتی۔ یودوکیہ لڑکوں کو چائے پلاتی۔

وہ یہ دیکھ کر بے حد مسرور تھی کہ اندر ہے ایک ذہین اور خوش اخلاق نوجوان بنتا جارہا ہے۔ اپنے کونے میں بیٹھا بیٹھا پاویل بڑے لڑکوں کا گانا بجانا اور گفتگو سنتا اور کارٹون اور تصویریں بنانے میں مشغول رہتا۔

ایک دن احمد آن پہنچا۔

یودوکیہ نے دریچے سے باہر جھانکا تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گئی کہ احمد سڑک کے کنارے کھڑا مکان کو گھور رہا ہے۔ وہ وہاں کافی دیر سے موجود ہوگا۔ کیونکہ اس کا اوورکوٹ اور پوستین کی ٹوپی شرابور ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ یودوکیہ کو احساس ہو کہ وہ کیا کر رہی ہے، اس نے خود کو مکان کی برساتی میں موجود پایا۔ احمد کا چہرہ بارش میں جھلملا رہا تھا اور اس کے سفید دانت چمک رہے تھے۔ اس نے یودوکیہ کو مضبوطی سے اپنی بانہوں کی گرفت میں لے لیا۔

"کیا کر رہے ہو — لوگ دیکھ لیں گے۔ بھاگ جاؤ" یودوکیہ نے زیرِ لب کہا، اس کا سر چکرا رہا تھا۔ لیکن پرنالوں سے گرتے ہوئے بارش کے پانی سے شرابور ہو جانے کے باوجود وہ اسی طرح کھڑی رہی۔

"اندھیرا پڑے رزگو لیائی اسٹریٹ آجاؤ۔ میں ڈبل روٹی کی دوکان کے پاس انتظار کروں گا" احمد نے تیزی سے کہا۔ اس کے بعد وہ کئی بار پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتے ہوئے وہاں سے ہوا ہو گیا۔ وہ اسے نکڑ پر غائب ہوتا دیکھتی رہی پھر لرزتی ٹانگوں کے ساتھ گھر کے اندر آئی شام پڑے وہ رزگو لیائی اسٹریٹ چلی گئی۔

۱۱

وہ رات کو بہت دیر سے گھر لوٹی۔ خزاں کی اس اندھیری بھیگی رات میں وہ وقت کا سارا احساس کھو چکی تھی۔

احمد نے کہا تھا کہ اس کی گھڑی بند ہو گئی ہے۔ اس نے یودوکیہ کو گھر تک پہنچایا تھا اور راستے میں جگہ جگہ تاریک دروازوں اور کونوں کھدروں میں ٹھٹھک کر اسے پیار کرتا رہا تھا۔

گھر کے سارے دریچے تاریک تھے، کچھ دیر خاموش کھڑی رہنے کے بعد اس نے ایک اندھیری کھڑکی پر دستک دی۔ اس کا خیال تھا کہ اسے بہت دیر تک پٹ کھٹکھٹانا پڑے گا کیونکہ یودوکیم اور سارے بچے ہمیشہ گھوڑے بیچ کر سوتے تھے۔ لیکن جلد ہی اسے سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ سنائی دی پھر کسی نے چٹخنی کھولی۔ شب خوابی کے لباس میں پاویل سامنے آیا۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

"جاؤ جا کر سو جاؤ، میں تالا خود لگا لوں گی۔ جلدی بھاگو، نہیں تو زکام ہو جائے گا" یودوکیہ نے سرگوشی میں کہا۔

پاویل نے حکم نہیں مانا اور جب تک یودوکیہ نے چٹخنی چڑھائی وہ اس کے نزدیک کھڑا رہا۔ سردی کی وجہ سے اس کے دانت کٹکٹا رہے تھے اسے کندھوں سے پکڑ کر یودوکیہ کمرے کے اندر لے گئی۔ "جا کر سوؤ گے" اس نے دوبارہ تاکید کی

"ابھی میرا دل نہیں چاہ رہا سونے کو" پاویل نے اونچی آواز میں

جواب دیا۔ نتالیہ چولھے پر لیٹی بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔

"آہستہ بولو، سارے گھر کو جگادو گے" یودوکیہ نے سرگوشی کی۔

"کاتیہ کے علاوہ سب جاگ رہے ہیں۔ ابا اور آندرے تمھیں ڈھونڈنے باہر گئے ہوئے ہیں، تم کہاں چلی گئی تھیں اماں"۔

"جاکر سو جاؤ پاویل"۔

اس نے لڑکے کو اس کے بستر پر لٹا کر لحاف اڑھا دیا۔ اپنے کمرے میں آکر کپڑے بدلے اور روشنی جلائے بغیر اپنے پلنگ پر جا گری۔ اندھیرے میں آنکھیں کھولے وہ یودوکم اور آندرے کی واپسی کی منتظر رہی۔ باہر موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ پانی کی تیز بوچھاریں چھت پر شور کر رہی تھیں۔ دفعتاً اسے بے حد ندامت ہوئی۔ دن بھر کی محنت کے بعد اب وہ دونوں اس آندھی بارش میں اس کی تلاش میں گئے ہوئے تھے اور بچے اس کے انتظار میں اب تک جاگتے رہے تھے۔ پھر اس نے اپنے آپ کو سمجھانا چاہا کہ یہ اس کا اپنا ذاتی معاملہ تھا اور اس کی وجہ سے کسی کو کوئی نقصان یا رنج پہنچنے کا خطرہ نہ تھا۔ کسی قانون میں نہیں لکھا تھا کہ ایک انسان دوسروں کی خاطر اپنی ذاتی خوشیوں کو قربان کردے۔ "مجھے ڈھونڈنے کو جانے کے لئے کس نے کہا تھا؟ آرام سے پڑ کر سوتے!" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ مگر کسی اندرونی آواز نے اس سے سرگوشی کی کہ اس نے اپنے آپ کو ملوث کر دیا ہے، کہ ان سارے بھولے اور معصوم لوگوں کے درمیان صرف وہی ایک ناپاک ہستی ہے ــــ

"خدایا! احمد کمبخت واپس کیوں آگیا؟" مگر اسے اسی وقت یہ بھی معلوم تھا کہ کل شام کو اسی طرح دوبارہ رزگولیانی اسٹریٹ جائے گی اور اسی طرح چپکے سے گھر میں داخل ہوگی اور بچوں سے نظریں ملاتے ہوئے گھبرائے گی۔

بہت دیر بعد پانی میں بھیگے اور غصّے میں تلملاتے یودو کِم اور آندرے گھر واپس آئے۔ جہاں جہاں ان کا خیال ہو سکتا تھا وہ یودو کیہ کو ڈھونڈ آئے تھے۔ پولیس کی چوکی اور مردہ گھر تک جھانک آئے تھے۔ یودو کیہ نے ان کے لیے دروازہ کھولتے یہ ظاہر کیا گویا وہ ان دونوں سے بہت خفا ہے۔

"کہاں غائب ہو گئی تھیں؟" یودو کِم نے سوال کیا۔

"یہ خواہ مخواہ کا ہنگامہ کیوں کھڑا ہو گیا؟ میں اپنی ایک سہیلی کو زچہ اسپتال لے گئی تھی۔ اور تم میری ناک کٹانے کو مجھے ڈھونڈنے کیلئے مارے مارے پھر رہے تھے۔ ہونہہ" دیوار کی طرف چہرہ کر کے اس نے شوہر کو جواب دیا۔

اپنی سہیلی ماشا اُوچینی کووا سے وہ تقریباً چھ مہینے سے نہیں ملی تھی۔ لیکن ایک روز قبل ہی اس نے سُنا تھا کہ ماشا ولادت کے لئے اسپتال جانے والی ہے۔

"یہ کون سی سہیلی ہے تمھاری؟"

"ماشا اُوچینی کووا —— اگر دل چاہے تو جا کر معلوم کر لو، جاؤ نا —— آندرے —— کو بھی ساتھ لے جاؤ۔"

"کم از کم ہمیں بتلا تو دیا ہوتا کہ کہاں جا رہی ہو" یودو کِم نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

یودو کیہ پلنگ پر اٹھ بیٹھی، ندامت اور ضد کے آنسوؤں نے اس کا گلا روندھ دیا اور اس کا دم گھٹنے لگا۔

"اچھا۔ میں تم کو ابھی سے بتائے دیتی ہوں کہ میں کل شام بھی اسے دیکھنے اسپتال جاؤں گی، سنا تم نے؟"

"چلانے کی ضرورت نہیں ہے" یودوکم نے درشتی سے کہا۔ "بچوں کو سونے نہیں دیتیں" وہ خاموش ہوگئی اور رات بھر جاگتی رہی۔ غصہ، شاید اپنے اوپر ---- دل کا درد، اور بہت سے ایسے جذبات جن کی وہ تشریح نہ کر سکتی تھی، اسے تڑپائے ڈال رہے تھے۔

دوسری شام احمد اس سے ملنے معینہ مقام پر نہیں آیا۔ یودوکیہ نے ڈبل روٹی کی دوکان کے قریب اس کا بہت دیر تک انتظار کیا اور تھکی ہاری اور مایوس گھر لوٹ آئی۔

یہ بہت اچھا ہوا کہ وہ جلد گھر لوٹ آئی۔ یودوکم پہلے سے آچکا تھا اور باورچی خانے میں بیٹھا جاڑوں میں پہننے والے نمدے کے جوتے مرمت کرنے میں منہمک تھا۔ پاویل اور کاتیہ اس کے پاس بیٹھے تھے۔ وہ انھیں شاید کوئی مزاحیہ کہانی سنا رہا تھا کیونکہ وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔

"دیکھا میں کیا کر رہا ہوں؟" اس نے دریافت کیا۔ "میں نے ان جوتوں کو خاصا ٹھیک کر لیا" پھر اس نے اپنی بیوی کو دھیان سے دیکھا اور اضافہ کیا "اور ماشا کے کیا حال چال ہیں؟ بچہ ہوگیا؟"

"پتہ نہیں" یودوکیہ نے خشکی سے جواب دیا "میں وہاں گئی ہی نہیں۔"

اب اس میں جھوٹ بولتے رہنے کی سکت نہ تھی۔ وہ ہر چیز سے اکتا چکی تھی۔ احمد نے کیا کیا؟ کیوں نہیں آیا؟ کیا کل رات وہ احمد کو مسرور نہ کر سکی تھی؟ باہر باڑے میں جا کر اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

معلوم ہوتا تھا کہ یودوکم نے بیوی پر دھیان نہیں دیا۔ کیونکہ وہ اسی طرح بچوں سے ہنسی مذاق میں مصروف رہا۔ لیکن رات کے کھانے کے بعد کمرے کی تنہائی میں اس نے یودوکیہ سے کہا۔

" سنو - آج ساری بات صاف کر لینی چاہیے - مجھ کو تمہارا یہ رنگ ڈھنگ بالکل پسند نہیں - ماضی میں تو جو کچھ ہوا — خیر ہٹاؤ اس قصے کو - لیکن اب میں اس قسم کی دھوکہ بازی برداشت نہیں کر سکتا - میں سچائی اور شرافت کا قایل ہوں " - اس نے اپنے بھاری ہاتھ سے میز پر مکا مارا " اگر تم کو احمد چاہیے تو تمھیں مبارک ہو - لیکن تمہارا اس طرح بھاگ بھاگ کر چوری چھپے اس سے ملنا میں گوارا نہیں کر سکتا سمجھیں ؟ آج میں نے اس کی تھوڑی سی ٹھکائی کی ہے - لیکن اگر اب کی بار مل گیا تو اسے اتنا ماروں گا کہ اس کا خاتمہ ہو جائے گا - اور تم گدھیا کی وجہ سے اس کے قتل کے جرم میں مجھے جیل کی ہوا کھانی ہوگی - اس کے بعد بچوں کا کیا حشر ہوگا — ؟ تمہارے کارن بچوں کی زندگی تباہ ہو جائے گی - وہ بے ٹھکانہ ہو جائیں گے - تم نے کبھی یہ بھی سوچا ؟ کیا جنسی طلب کے علاوہ تمہارے پاس ذرہ برابر عقل یا انسانی ہمدردی نہیں ہے ؟ مگر یہ صحیح نہیں ہو سکتا تم سمجھدار بھی ہو اور ایک دردمند دل بھی رکھتی ہو - اور تم اپنے اس ہیجان پر قابو پا سکتی ہو "

" تم نے احمد کو کیا کہا ؟ " یودوکیہ نے آہستہ سے پوچھا -

یودوکم نے سوچتے ہوئے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا " میں نے اسے جا پکڑا اور کہا " اگر تم میری بیوی کے خواہش مند ہو تو شریفوں کی طرح اسے حاصل کرو - ورنہ میرے راستے سے ہٹ جاؤ - اپنا منہ کالا نہ کرو ' اس نے فوراً لڑنا شروع کر دیا - گدھا کہیں کا - چنانچہ اس کے حواس درست کرنے کے لئے میں نے ذرا سی اس کی مرمت کر ڈالی - ممکن ہے فوجداری کے الزام میں وہ مجھے عدالت میں پہنچا دے "

یودوکیہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپالیا۔

"آنسو مت بہاؤ اور میری تجویز پر دھیان دو" یودوکم نے اپنی بات جاری رکھی۔ "میں پرانے فیشن کا ظالم شوہر نہیں ہوں جو تمھاری مرضی کے خلاف تمھیں اپنے سے باندھے رکھوں۔ اگر تم کو اس شخص سے اتنا زبردست عشق ہے کہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتیں تو بڑی خوشی سے اس کے پاس چلی جاؤ۔ لیکن اس صورت میں مجھ کو اپنی زندگی سے خارج سمجھو۔ کیا تمھیں یہ ڈر ہے کہ بے ٹھکانہ ہو جاؤں گا؟ اس کی فکر نہ کرو میں تمھیں گھر سے نہیں نکال رہا ہوں۔ یہ گھر تمھارا ہے اور تمھارا ہی رہے گا۔"

یودوکیہ نے حیرت سے اپنے شوہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے دیکھا" اور تمھارا کیا بنے گا؟"

"میں اپنے متعلق بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں اور بچے اپنے لئے ایک اور مکان بنالیں گے۔ کیونکہ بچوں کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ میں انھیں احمد کے حوالے نہیں کر سکتا اور تمھیں بھی میں بڑے رنجیدہ اور دکھی دل کے ساتھ چھوڑوں گا! اور تبھی چھوڑوں گا جب تم بتا دوگی کہ تم میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتیں۔ لیکن میں اس بدمعاش پر بالکل بھروسا نہیں کر سکتا۔ وہ انتہائی لپاڑی اور ناقابل اعتبار آدمی ہے مگر بہرحال یہ تمھارا ذاتی معاملہ ہے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

جب اس نے دیکھا کہ یودوکیہ پر گھڑوں پانی پڑ گیا ہے تو وہ الم سے مسکرایا۔

"یہی میری تجویز ہے، تم کو فوراً اسی وقت فیصلہ کر لینا چاہیے۔ جس طرح احمد چاہتا ہے ہم اس انداز میں زندگی نہیں گزار سکتے۔ میں تم کو بیچ

سچ بتا دینا چاہتا ہوں کہ کل رات میری عمر میں دس سال کا اضافہ ہو گیا۔ فیصلہ کر لو۔ لیکن میں تمہارا اس سے چوروں کی طرح ملاقاتیں کرنا برداشت نہیں کروں گا۔ میں تمہارے مرحوم باپ کی طرح کا انسان نہیں ہوں۔ اور اس طرح کی ذلیل حرکتیں گوارا ہی نہیں کر سکتا۔ یہ یاد رکھو۔ تم یہ نہیں سمجھ سکتیں کہ تم میری ذمے داری ہو؟"

وہ گم سُم بیٹھی رہی۔ یوسف وکیم باورچی خانے سے باہر چلا گیا۔ پھر پلنگ کمرے کی طرف رخ کرنے کے بجائے . . . صدر دروازے میں تالا لگا کر وہ دوسری منزل پر لڑکوں کے کمرے کی طرف چلا گیا۔

مکان پر سناٹا چھا گیا۔ وہ اس سناٹے میں اس طرح بیٹھی رہی جیسے اپنے مستقبل کی تنہائیوں کا سامنا کرنے کی تیاری کر رہی ہو۔

اسی طرح وہ احمد کے انتظار میں اپنی شامیں گزارا کرے گی۔ بارش چھت پر برستی ہو گی اور اسے کبھی اس بات کا وثوق نہ ہو گا کہ احمد آئے گا یا نہیں۔ وہ قابل اعتماد آدمی نہیں تھا۔ لیکن کیسا، بانکا سجیلا خوبصورت آدمی تھا

بارش کی بوندیں لگاتار چھت پر ٹپ ٹپ گریں گی اور یہ گھر قبر کی طرح خاموش پڑا رہے گا۔ جن لوگوں نے ان در و دیوار کو زندگی کی رونق بخشی وہ اسے چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ کوئی اس کا پرسان حال نہ ہو گا۔ اب وہ کسے پالے پوسے گی، کس کی خبر گیری اور دیکھ بھال کرے گی۔ دن بھر کے واقعات اسے کون سنائے گا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں اس سے اب کون کرے گا۔ اگر کبھی اتفاق سے سڑک پر اس کی ان لوگوں سے مڈبھیڑ ہو گئی اور انھوں نے اس کو "اماں" کہہ کر مخاطب بھی کیا تو بھی اس پیارے لفظ کے کوئی

معنی نہ ہوں گے۔

وہ لرز کر رونے لگی کیتنی بھیانک بات تھی۔ اس نے صدمے کے ساتھ سوچا کہ احمد کی وجہ سے ان سب کو اور یہ سب گھر بار چھوڑنا پڑے گا۔ تاکہ ان کمروں میں وہ احمد کے ساتھ عشق کر سکے

سب سے زیادہ تکلیف وہ خیال یہ تھا کہ اسے یودوکم جیسے مہربان، سمجھ دار اور محنتی انسان کو چھوڑنا پڑے گا۔ اس کو چھوڑنے کا مطلب تھا گھر، کُنبہ، پریوار، ہر چیز سے ترک تعلق۔

یودوکم کے ساتھ ایسی بے انصافی ناقابل برداشت تھی۔ اب وہ زور زور سے سسکیاں بھرنے لگی۔ یودوکم نے اس کی سسکیوں کی آواز سنی ہو گی مگر وہ اسے دلاسا دینے کے لئے نیچے نہیں آیا۔ وہ کچھ دیر تک روتی رہی اس کے بعد اس نے اپنے آپ سے سوال کیا "میں اتنی بے وقوف عورت ہوں ان آنسوؤں کی کیا ضرورت ہے؟ یودوکم نے کیا مجھ سے کہا نہیں کہ مجھے اپنا فیصلہ خود کرنا چاہیے؟ یہ مجھ پر منحصر ہے کہ میں ہی فیصلہ کر دوں کہ یودوکم اور احمد میں سے کون میرا ہے؟"

اس خیال سے اسے ذرا سکون اور چین ملا۔ اس نے منہ دھویا اور ایک مسرور اور مجرم سی مسکراہٹ کے ساتھ دعا مانگی اس نے یودوکم اور بچوں کی صحت اور درازی عمر کے لئے دعا مانگی اور اپنے لئے دعا مانگی اور پھر سونے کے لئے چلی گئی۔ صبح کو جب یودوکم اور آندرے نیچے آئے تو چولھا حسب معمول سُلگ رہا تھا، ناشتہ تیار تھا اور یودوکیہ متانت کے ساتھ کھانے کی میز پر کام کاج میں مشغول تھی

ان معاملات کے متعلق انھوں نے ایک لفظ کسی سے نہیں کہا، لیکن

نجانے کس طرح کارخانے میں بات پھیل گئی۔ غالباً "شہر خبرو" ماریوشکا کے ذریعے، جس نے یودوکم کو اطلاع دی تھی کہ احمد شہر میں وارد ہو چکا ہے۔ شدہ شدہ یہ خبر آگے بڑھی اور ایک دن اوزار بنانے والا بدزبان کاریگر موکی لیف کسی وجہ سے آندرے پر برس پڑا اور آندرے کو "طوائف کا پالا" کی گالی دی۔ اس سے پہلے کہ دوسرے بیچ بچاؤ کرتے، آندرے، موکی لیف پر ٹوٹ پڑا۔ موکی لیف نے اس پر مکوں کی بوچھار کر دی مگر آندرے ڈٹا رہا۔ قوی ہیکل کاریگر اس نوعمر لڑکے کے غیظ و غضب سے ڈر گیا۔ "ابے احمق! ہوش میں آجا۔ ابے چھوکرے۔ وہ تاتاری تیری ماں کا یار ہے۔ تو نہیں جانتا"

بہت سے کاریگروں نے آندرے کا بازو پکڑ کر اسے موکی لیف سے جدا کیا۔ لڑائی میں آندرے کے دانت ٹوٹ گئے تھے اور ان میں سے خون نکل رہا تھا۔ خون تھوکتے ہوئے آندرے نے چلّا کر کہا "اس حرامزادے کے ہاتھ پاؤں توڑ دونگا"

آندرے کو کومسومول کمیٹی کے سامنے بلایا گیا جس کے اراکین نے ایک دوستانہ لیکن مستحکم انداز میں جھگڑے کے متعلق اس سے پوچھ گچھ کی۔ آندرے اڑا رہا کہ وہ حق بجانب تھا۔ "اس نے اس ہستی کو گالی دی جو میری ماں ہے، ماں سے بھی زیادہ ہے" لیکن جب اسے کومسومول سے نکالنے کی دھمکی دی گئی تب وہ ذرا نرم پڑا۔ بری طرح روتے ہوئے اپنی مٹھیاں بھینچ کر اس نے اپنے آنسو پونچھے اور وعدہ کیا کہ اب موکی لیف سے نہیں لڑیگا۔

یودوکم نے اپنی بیوی کو آندرے اور موکی لیف کے مابین مار پیٹ کی وجہ نہیں بتائی۔ احمد کا پھر کبھی کوئی ذکر نہیں نکلا۔ وہ شہر سے جا چکا تھا۔ وہ جگمگاتے دانتوں والا شیطان طوفان کی طرح آیا اور اتنے صدموں اور جگر

پاشیوں کا باعث بننے کے بعد بجلی کی طرح غائب ہو گیا۔

۱۲

دریچے پر دستک ہوئی، باہر اندھیرا چھا چکا تھا، بچے ابھی ابھی اپنے بستروں میں گھسے تھے۔ یودوکم ابھی کارخانے سے واپس نہیں آیا تھا، غالباً کسی جلسے کی وجہ سے اسے دیر ہو گئی تھی۔ جب یودوکیہ نے صدر دروازہ کھولا تو باہر کوئی موجود نہ تھا۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ برف کے گالے آہستہ آہستہ نیچے گر رہے تھے۔ یودوکیہ کواڑ بند کرنے ہی والی تھی کہ اپنے قدموں کے پاس اسے ایک منحنی سی آواز سنائی دی۔ نیچے جھکی تو اس نے دیکھا کہ آواز ایک بھورے رنگ کی گٹھری سے آ رہی ہے۔ وہ گٹھری اٹھا کر اندر لے گئی اور اسے آٹے کے ٹین کے اوپر رکھ دیا۔

بھیگے ہوئے کپڑے کی تہیں کھول کر اس نے بچہ باہر نکالا۔ بچہ پانچ یا چھ ہفتے کا رہا ہوگا کیونکہ وہ اپنا سر اٹھا سکتا تھا۔ اپنی قید سے آزاد ہو کر اب اس نے ٹانگیں چلانی شروع کیں اور ان کو اپنے پیٹ کی طرف لے گیا۔ یہ لڑکا تھا۔ اس نے اپنا ننھا سا مکا اپنے منہ میں ٹھونس رکھا تھا اور اپنا پیٹ بھرنے کا مطالبہ کر رہا تھا۔

"ٹی ہو — ٹی ہوں" اپنا سر اِدھر اُدھر گھما کر اس نے اصرار شروع کیا۔

یودوکیہ نے اسے چپ کراتے ہوئے اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ اس کے چہرے پر ایسا رنگ آ گیا جیسے وہ اپنے پیٹ کی اولاد کو دودھ پلانے والی ہو۔ بچہ ٹسوے بند کر کے یودوکیہ کی صدری پر منہ مارنے لگا۔ جب یودوکیہ نے

اسے کنستر پر واپس رکھا تو اس نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ یودوکیہ نے تیزی سے چولھے کے پاس جا کر ایک بوتل میں گرم دودھ انڈیلا۔ صاف کپڑے کا ٹکڑا بوتل کے منہ میں ٹھونسا اور بچے کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ بچے نے اطمینان کی سانس لی اور چسر چسر دودھ پینے میں مشغول ہو گیا۔

"ندیدہ کہیں کا ـــــ!" یودوکیہ نے بڑے پیار سے کہا۔ دودھ پلانے کے بعد اس نے چلیچی میں گرم پانی بھرا اور بچے کو نہلانے کے انتظام میں جٹ گئی۔ بچہ نہاتے میں احتجاجاً ہاتھ پاؤں مارتا رہا، مگر رویا بالکل نہیں یودوکیہ نے اسے بڑی مہارت سے نہلایا، اور تجربہ کار ماؤں کی طرح اس کی پشت پر سے پانی خود چوسا تاکہ بچہ نظر بد، جادو ٹونے اور دوسری آفات و بلیات سے محفوظ رہے اور صحتمند اور مضبوط بنے۔ اس کے بعد اس بچے کو اپنے کمرے میں لے جا کر پلنگ پر لٹا دیا۔

"آہا ... راجا بٹیا ہے، میرا چاند، میرا لال، میرا منّا۔" وہ بچے کا جسم پونچھتے ہوئے کہتی رہی۔ بچہ چپ تھا اور بار بار بجلی کی روشنی کی طرف مڑ رہا تھا۔ یودوکیہ نے اسے ایک پرانی چادر میں لپیٹ دیا۔ پہلے اپنی پرانی پیٹیوں میں جکڑا۔ وہ ایک موٹا سا کیڑا معلوم ہوتا تھا اور کیڑے ہی کی طرح اپنا سر اِدھر سے اُدھر گھماتا تھا۔ اب نہانے کے بعد اس کے سر کے بال خاصے کالے معلوم ہونے لگے۔

"اور اب میرا چندا ننی ننی کرے گا، ہے نا میرے بیٹے؟" یودوکیہ نے اس کے کان میں کہا، اسے لحاف اڑھایا اور بتی بجھا کر یہ دیکھنے کمرے سے باہر چلی گئی کہ کس قسم کا کمبل تا ٹوپی بچے کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔ بھورے رنگ کی گٹھری میں سے ایک پرانی بنیان، فلالین کے کمبل کا ایک

ٹکڑا، اور معمولی قسم کے چند سوتی کپڑے برآمد ہوئے۔ یودوکیہ نے سب چیزیں گیلری میں رکھی ہوئی ایک الماری میں پھینک دیں، اسی وقت کاغذ کا ایک ٹکڑا اس میں سے باہر آن گرا۔ اس پر لکھا تھا "نام الیکزنڈر رکھا گیا"۔ یودوکیہ کو خیال آیا کہ بہت اچھا نام ہے اور آسانی سے شورا، ساشا یا سانیہ بن سکتا ہے اور مختصراً الیک بھی پکارا جا سکتا ہے۔

یودوکِم کام سے واپس آیا۔ وہ تھکا ہوا تھا اور کسی وجہ سے اس کی طبیعت مکدر معلوم ہو رہی تھی کیونکہ منہ دھونے میں اس نے معمول سے زیادہ دیر لگائی۔ یودوکیہ کو خبر سنانے کی ہمت نہ پڑی۔ شاید وہ نیا بچہ پالنے پر تیار نہ ہو۔ یودوکِم کپڑے بدل کر چپ چاپ میز پر بیٹھ گیا۔ کھانا اس کے سامنے رکھتے ہوئے یودوکیہ نے سوچا کہ بات کس طرح شروع کرے۔

"آج میٹنگ اتنی دیر میں کیوں ختم ہوئی؟" اس نے شوہر سے دریافت کیا۔

"ایک آدمی کا مقدمہ تھا"۔ یودوکِم نے بادلِ ناخواستہ جواب دیا۔ "کارخانے کی دھات چرا کر اس کے برتن بنا رہا تھا اور ان کو بازار میں بیچ رہا تھا"۔

"مقدمہ کس نے چلایا؟"

"خود ہم لوگوں نے"۔

"تم لوگوں نے؟" اس نے بے خیالی سے دہرایا۔ وہ اپنے مسئلے کے متعلق فکرمند تھی۔ آخر کچھ توقف کے بعد اس نے بغیر کسی تمہید کے کہہ دیا۔ "پلنگ کمرے میں جاؤ تو روشنی مت جلانا اور بغیر دیکھے دھم سے پلنگ

پر مت جا پڑنا۔ بچّہ دب کر رہ جائے گا۔"

"بچّہ؟ کیسا بچّہ؟"

"ہمارا اپنا بچّہ ۔ لڑکا ہے۔"

کھانا ختم کر کے وہ اپنے کمرے کی طرف گیا۔ یودوکیہ اس کے پیچھے پیچھے گئی ۔ اس نے روشنی جلائی، لحاف اٹھایا اور بچّے کے گلابی متبسّم چہرے پر نظر ڈالی۔

"کس کا بچّہ ہو سکتا ہے یہ؟"

"ہمارا اپنا" یودوکیہ نے بہادری سے جواب دیا۔ بچّہ سوتا رہا۔

"کوئی اسے ہمارے دروازے پر ڈال گیا ہے؟"

"ہاں۔ مگر یہ بڑی خوش قسمتی کی نشانی ہے۔" یودوکیہ نے جلدی سے جواب دیا۔ "خدا ہمیشہ اس گھر پر اپنی برکتیں نازل کرتا ہے جہاں لاوارث بچے پلتے ہوں۔"

روشنی کی وجہ سے بچّے کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے سر اِدھر اُدھر کر کے پیٹیوں سے آزاد ہونے کی کوشش کی۔

یودوکم ہنس پڑا۔

"لڑکا ہے؟"

"ہاں۔ الیکزینڈر نام ہے۔"

تم کو کیسے معلوم؟"

"ایک پرچی پر لکھا تھا۔"

یودوکم پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔

"بہت خوب۔" اس نے بے حد اہم نظر آتے ہوئے بچّے کی طرف دیکھ

کمزور آواز میں کہا" اور یہ خاکسار اب کہاں سوئے؟"

"تم دیوار کی طرف سو جاؤ۔ میں تمہارے اور بچّے کے درمیان لیٹ جاؤنگی۔"

"ہمیں بہت خیال رکھنا پڑے گا کہ کہیں مُنّے کو کچل نہ ڈالیں"۔ یودوکم نے بڑی احتیاط سے طویل و عریض لحاف کے ایک گوشے کے اندر پناہ لیتے ہوئے کہا۔ "اس کے لئے ایک پالنا تیار کروں گا" اس نے بڑی سنجیدگی سے بات جاری رکھی۔ "کیونکہ بچّہ بڑی نازک شے ہوتا ہے۔ پھول کی طرح نرم ہوتی ہیں اس کی ہڈیاں۔ ہاں بھئی۔"

۱۳

اڑوسی پڑوسی نئے بچّے کو دیکھنے کے لئے آئے۔ انھوں نے بچے اور اس کے نئے ماں باپ کی تعریف کی اور ان بدکار ماؤں پر تین حرف بھیجے جو جاڑے کی اندھیری راتوں میں اپنی اولاد کو اجنبی دہلیزوں پر چھوڑ آتی ہیں۔

میری یوشکا بھی آئی۔ اس کی آمد بڑی گمبھیر اور باوقار تھی، بڑی متین لیکن تحکمانہ آواز میں اس نے پاویل، کاتیہ اور نتالیہ سے دریافت کیا آیا وہ اسکول میں دل لگا کر محنت کر رہے تھے، اپنے منہ بولے والدین کا حکم مانتے تھے اور یہ کہ انھوں نے گھر کے اندر جوتے کیوں پہن رکھے تھے، گھر کے اندر سردی نہیں تھی اور ان کو اپنے جوتوں کو حفاظت سے پہننا چاہیے تاکہ وہ جلد نہ گھسیں کیونکہ اُن کے منہ بولے ماں باپ بہت پیسہ خرچ کرکے اُن سب کو جوتے پہنائے رکھتے ہیں۔ پھر ایک ڈاکٹر کی طرح اس نے حکم دیا کہ بچّہ اس کے ملاحظے کے لئے پیش کیا جائے۔

یودوکیہ کپڑوں میں لپٹے، لیس کی ٹوپی پہنے ننھے ساشا کو لے کر آئی اسے دیکھتے ہی ماری یوشکا نے ایک آہ بھری۔

"بچّہ بدقسمت ہے۔"

"کیوں؟" یودوکیہ نے سہم کر پوچھا۔

"اس کی آنکھوں میں دیکھو ــــ" ماری یوشکا نے سرگوشی میں کہا۔

یودوکیہ نے نیلی آنکھوں میں جھانکا جس کی پتلیوں میں اپنے چہرے کے عکس کے سوا اسے کچھ اور نظر نہیں آیا۔

"آنکھ کے گوشے میں دیکھو، گوشے میں ــــ" ماری یوشکا نے کھُس پھُس جاری رکھی۔ "اگر بچّے کو جینا ہے تو اس کی ناف اُس کی پتلیوں میں صاف نظر آجائے گی، اس بچّے کی آنکھوں میں کچھ دکھائی نہیں دیتا، یہ تمھارا خداداد پوت جینے والا نہیں ہے۔"

سارے گھر پر اداسی کی برکھا کر کے اور رائی کی شراب کا جھاگوں جھاگ گلاس چڑھانے کے بعد ماری یوشکا چلتی بنی۔

دوسرے روز ساشا کو پیٹ کی کچھ شکایت ہوگئی۔ یودوکیہ نے اسے کیسٹر آئل پلایا اور پلٹس باندھی۔ جب افاقہ نہ ہوا وہ اسے لے کر "زچہ بچہ ویلفیر سنٹر" گئی۔

تم اسے ضرورت سے زیادہ غذا دے رہی ہو۔" سفید کوٹ اور سیاہ بالوں والی لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ اس نے بتایا کہ ساشا کو ہر چوتھے گھنٹے بعد دودھ پلایا جائے، رات کو بالکل نہیں، اور دودھ میں چاول کا پانی ملایا جائے۔

یودوکیہ ڈاکٹر کی حکم عدولی کرنے سے ڈرتی تھی مگر اس کا دل بچے

کے لئے کٹتا رہا جو ہر ایک گھنٹے بعد دودھ کے مطالبے میں روتا تھا اور پھر روتے روتے تھک کر سو جاتا تھا۔

"اگر اس کا اپنا بچہ ہوتا تو ڈاکٹرنی اسے اس طرح بھوکا مارنے کے لئے نہ کہتی" یودوکیہ نے دل میں کہا۔ "اس طرح تو میرا منا بھوک سے بلبلا بلبلا کر جان دیدے گا۔"

لیکن بچے کو غذا کے نئے اوقات کی عادت پڑ گئی اور رات کو آرام سے سونے لگا۔ یہ مارچ کی بات ہے' اپریل میں پاویل اسکول سے کالی کھانسی لگا لایا اور ساشا سمیت گھر کے سارے بچوں کو کالی کھانسی ہوگئی۔ بڑے بچوں پر تو ہلکا سا اثر تھا مگر ساشا پر اتنا شدید دورہ پڑا کہ ہر مرتبہ یودوکیہ دہل دہل جاتی کہ وہ اب چلا کہ اب چلا۔ وہ اس کی آنکھوں کو غور سے دیکھتی کہ پتلیوں میں ناف کی تصویر نظر آجائے جو درازئ عمر کی نشانی تھی۔ کھانسی ختم ہوئی تو کاتیہ اور ساشا کو خسرہ نکل آئی۔

"اس کا انجام اچھا نظر نہیں آتا۔" یودوکم نے بچے کو تیز بخار میں پھنکتے دیکھ کر کہا۔ "یہ ننھی سی جان ایسی کڑی بیماریاں کیسے جھیل سکے گی؟ مجھے لگتا ہے کہ ہمیں بہت رنج دیکھنے ہیں۔" اس نے اپنا لمبا چوڑا ہاتھ بڑھا کر یودوکیہ کے سر پر پھیرا، تین مہینے سے وہ بچے کی پلنگ کی پٹی پکڑے بیٹھی تھی، دبلی اور کمزور ہوگئی تھی اور مسکرانا بھول چکی تھی۔

"میں منے کو مرنے نہیں دوں گی یودوکم۔" اس نے اپنے میاں کو ایسی آواز میں مخاطب کیا جو اس نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ "میں اس کا مرنا نہیں چاہتی اور موت کو اس کے قریب پھٹکنے نہیں دونگی۔"

سارے موسم بہار، وسط گرما تک ساشا بیمار رہا۔ پہلے اسے

دردشکم اور اس کے بعد موٹے دانتوں والی خسرہ نے آن دبوچا۔پھر دانت نکلنے شروع ہوئے۔ بے حد کمزور اور چپ چاپ وہ اپنے پالنے میں شبنمی کے نیچے پڑا رہتا جو یودوکیہ نے صحن میں تان دی تھی۔ کاتیہ، پاویل اور نتالیہ باری باری اس کی تیمارداری کرتے اور مکھیاں اور مچھر اس نے آس پاس سے اڑاتے۔ کاتیہ خاص طور پر اسے بہت پیار کرتی تھی اور اس کے لئے اپنے کھلونے لاتی اور اس سے باتیں کرتی۔

"ہمارا ساشا کتنا پیارا ہے۔ ہمارا ننھا بھیا۔"

ساشا اپنی اداس آنکھوں سے لڑکی کو دیکھ کر اس کی رائے سے اتفاق ظاہر کرنے کے لئے غوں غاں کر دیتا، گھر کے دھندوں میں مصروف یودوکیہ بار بار صحن میں پڑے ساشا پر ایک نظر ڈال لیتی۔ ایک روز اس نے ایک اجنبی عورت کو پالنے کے پاس کھڑے ہو کر کاتیہ سے باتیں کرتے دیکھا، وہ عورت کہہ رہی تھی۔

"اس کی حالت اچھی نہیں۔ مرجائے گا۔"

یودوکیہ باہر آئی۔

"کون ہو تم۔ بڑی آئیں وہاں سے نحوست پھیلانے 'بھاگ جاؤ' تم سے مطلب؟"

"اے ہاں سچ تو ہے نہیں۔ تجھ سے کیا مطلب؟"

"کسی کمبخت نے میرے بچے کو نظر لگادی ہے اور اوپر سے دنیا بھر کے لوگ چلے آتے ہیں بدشگونی کی باتیں کرنے۔ چلی جاؤ یہاں سے۔" یودوکیہ نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

عورت ذرا طنزاً مسکراتے ہوئے پھاٹک کی سمت چلی گئی۔ وہ جوان

اور خاصی خوش شکل تھی۔ ذرا موٹی اور چہرہ ذرا سوجا ہوا سا تھا۔ اس کے کٹے ہوئے بال، چھوٹی چھوٹی لٹوں میں بکھرے تھے۔ ٹانگیں مگدر ایسی اور پاؤں میں بھدے، گھسے جوتے پہنے تھے۔

گرمیوں کے آخری دنوں میں احمد پھر آدھمکا۔ کسی کو اپنی طرف متوجہ کئے بغیر کئی مرتبہ گھر کے سامنے ٹہلتا رہا۔ پھر اس نے صحن میں جھانکا جہاں اسے بہت سارے بچے نظر آئے۔ ایک چھوٹا سا لڑکا اور لڑکی آلو کی کیاری کھود رہے تھے۔ ایک اور لڑکی ایک غوں غاں کرتے شیر خوار بچے کے پالنے پر درخت کی ٹہنی سے پنکھا جھل رہی تھی۔ احمد نے نیچی آواز میں سیٹی بجائی اور اُڑن چھو ہوگیا۔

دوسری صبح ماری یوشکا آن پہنچی اور یودوکیہ سے پوچھا۔ "ساشا کیسا ہے؟"

"شکر ہے، اب تو اچھا ہے۔" وہ ساشا کو پھل کی جیلی کھلا رہی تھی۔ دونوں ماں بیٹیوں کے چہرے بشاش تھے۔

"تم نے بھی اپنے آپ کو تیرے میرے کی اولاد کے پیچھے تج دیا۔ ماری یوشکا نے ہمدردی کے ساتھ کہا۔

"ہم عورتوں پر بڑھاپا بڑی تیزی سے آجاتا ہے۔ تم تو اب بھی بہت سجیلی ہو ___ پتہ ہے؟"

چمچے کے کنارے کے ذریعے ساشا کے منہ پر سے جیلی کے قطرے پونچھتے ہوئے یودوکیہ نے کہا ___ "ارے بس رہنے بھی دو۔ میری جوانی تو ختم ہو چکی۔"

"غاؤں، غاؤں۔" ساشا نے کہا۔

"بہت جلد ہمارے گھر میں بہوئیں داماد آجائیں گے" یودوکیہ نے اضافہ کیا

"احمد واپس آگیا ہے" ماری یوشکا نے پہلے ذرا احتیاط انداز میں چھت کو دیکھ کر پھر یودوکیہ پر نظر ڈالتے ہوئے بڑے واقعاتی انداز میں کہا۔

یودوکیہ نے بچے کو کھلانا ختم کر دیا اور بھیگی تولیہ سے اس کا چہرہ صاف کیا اور اسے پیار کرنے کے بعد جواب دیا "مجھے معلوم ہے۔ میں نے اسے کئی بار مکان کے سامنے سے گزرتے دیکھا ہے"

ماری یوشکا نے اپنے ہونٹ پچکا لیے۔

"گن گرہ میں تو اس کے دن بدل گئے" ماری یوشکا نے کہنا شروع کیا۔ وہاں وہ کوآپریٹیو کے لئے مال خریدتا ہے۔ اچھی تنخواہ ملتی ہے۔ خاصا کھاتا پیتا سمجھو اب اسے۔ تمہارے لئے بہت سے تحفے لایا ہے۔ ایک بھاری شال۔ ایک ہلکی ایرانی کڑھت کی۔ دو کشمیری اون کے ٹکڑے۔ ایک عنابی، ایک گہرا نیلا۔ کہتا ہے کہ بہت دکھی ہے کیونکہ بیتے دنوں کی یاد بہت ستاتی ہے ۔۔۔ حالانکہ یودوکیم نے تو اس کا کام ہی تمام کر دیا تھا"

"گویا میں اب بھی اس قسم کی عورت ہوں" یودوکیہ نے ساشا کو مخاطب کر کے کہا "لوگ ہاگ میرے لئے تحفہ لاتے ہیں اور گن گرہ تک سے چل کر آتے ہیں مجھ سے ملنے۔ اور ہم ان لوگوں سے کہیں گے" اس نے ساشا کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اُن سے تالیاں بجاتے ہوئے کہا "ہم ان سے کہیں گے کہ بیٹا جی اپنی ایرانی شالوں سمیت گن گرہ کا واپسی ٹکٹ کٹاؤ"

لیکن یودوکیہ جب سڑک کے نل سے پانی بھرنے کے لئے جا رہی تھی اس

وقت احمد نے اسے آلیا۔ اور راستہ روک کر اس نے یودوکیہ کی نازک کلائی اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام لی

"کیا بات ہے یودوکیہ، مجھے غچّا دینے کا ارادہ ہے؟ کیا اب میں تمہارے ناز اٹھانے کے لائق نہیں رہا؟"

تیز دھوپ میں اپنی آنکھیں چندھیاتے ہوئے یودوکیہ نے اسے سکون کے ساتھ دیکھا، اس کا چہرہ مسکرا رہا تھا۔

"لائق کیوں نہیں۔ شاید اب تم پہلے سے بھی زیادہ طرّم باز خاں ہو۔ پر مجھے اب تمھاری ضرورت نہیں رہی۔"

"سچ مچ ——؟" احمد نے بُرا مانتے ہوئے کہا اور اس کی کلائی اپنے سانولے ہاتھوں میں اور مضبوطی سے پکڑ لی۔

"چھوڑو میرا ہاتھ ——" یودوکیہ نے ایسی نظروں سے اس کو دیکھا کہ اس نے کلائی چھوڑ دی۔ یودوکیہ کی نگاہوں میں شدید سردمہری اور بے نیازی تیر رہی تھی۔

"بڑا افسوس ہے۔" احمد نے جواب دیا "ہماری محبت کس قدر خوبصورت تھی۔"

"اب میرا بھرا پورا کنبہ ہے، بچے ہیں۔"

"دوسروں کے بچے، مانگے تانگے کے۔" اس نے کہا اور یودوکیہ کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

"دوسروں کے بچے ہیں تو کیا ہوا؟" اس نے تیزی سے جواب دیا اور خالی بالٹیاں لئے آگے چلی گئی۔

احمد نے اس کا پیچھا نہیں کیا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ قصّہ ختم ہو چکا ہے۔ وہ اسی روز شہر سے چلا گیا۔

۱۴

مجموعی طور پر بچے مسرت اور راحت کے بجائے پریشانیوں کا پٹارہ تھے۔
اسکول ختم کرتے ہی نتالیہ ایک ٹیکنیکل کالج میں داخل ہوگئی۔ وہ ایک دم بیحد بد دماغ ہوگئی اور گھر کے کسی کام کو ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا۔ اماں خود سارا انتظام کر سکتی تھی جبکہ وہ جرمن زبان کا مطالعہ کرے گی۔

"گھر پر جرمن پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟" یودوکیہ نے اس سے پوچھا "تمھیں کالج میں جرمن نہیں پڑھاتے؟"

"پڑھاتے ہیں پھر کیا؟"

"کیا یہ کافی نہیں ـــ پڑھ پڑھ کر گھر بھر دیا۔ ہڈیوں کی مالا ہو رہی ہو۔"

نتالیہ نے بڑے صبر کے ساتھ وضاحت کی کہ کالج میں جرمن کی تعلیم ناکافی ہے ٹیکنیکل کتابیں پڑھنے کے لئے اس زبان کے گہرے مطالعے کی ضرورت ہے۔

"اتنا تو پڑھتی ہو ہر وقت ـــ حد ہے۔"

"اماں تمھاری سمجھ میں یہ باتیں نہیں آ سکتیں۔"

پاویل نے ایک ایسی تصویر بنائی جس میں گھاس کتھئی اور آسمان ہرا تھا، اور بادل اودے۔ یودوکیہ نے ان رنگوں کے متعلق شک وشبہ کا اظہار کیا، "آسمان ہرا ہوتا ہے؟"

"ہاں۔"

"پر ایسا ہرا ابھی نہیں ہوتا جیسا تم نے بنایا ہے۔"

"اماں تم یہ سب نہیں سمجھ سکتیں۔" پھر اس نے بتایا کہ اس کی یہ تصویر ایک

نمائش میں بھیجی گئی تھی۔ ظاہر تھا کہ لیودوکیہ کے پلے یہ سب نہیں پڑ تا تھا۔

کاتیہ پڑوس کے سارے بچوں کی ٹھکائی کر ڈالتی اور ان کی مائیں تلخی سے شکایت کرتیں کہ لیودوکیہ کے لاڈ نے اسے بگاڑ دیا ہے۔ تمتماتے چہرے کے ساتھ لیودوکیہ لڑکی کی طرفداری کرتی "یہ جھگڑے خود سے تو شروع نہیں کرتی۔ بچے لڑتے جھگڑتے ہی ہیں آپس میں۔ تمھارا بیٹا خود اپنا بچاؤ کیوں نہیں کرتا جو بھاگا بھاگا تمہارے پاس شکایت لے کر جاتا ہے؟"

اور جب مائیں واپس چلی جاتیں تو وہ افسوس کے لہجے میں کاتیہ سے کہتی: "دیکھو کاتیہ سب آ آ کر تمہارا رونا روتے ہیں۔ سب تمہاری حرکتیں ہیں۔"

وہ بچوں کو گالی گلوچ سے روکتی اور اگر کوئی بچہ بدزبانی کرتا تو ایک طمانچہ بھی رسید کر دیتی۔

ایک روز پاویل ایک تصویر بناتے بناتے اٹھ کر کمرے سے بھاگ گیا اور نامکمل تصویر اور رنگین پنسلیں میز پر ہی چھوڑ دیں۔ کاتیہ اندر آئی اور میز پر چڑھ کر ساری تصویر پر سرخ رنگ کی پنسل پھیر دی۔ ارادہ شرارت کا نہ تھا۔ محض یہ خواہش تھی کہ تصویر پہلے سے بہتر ہو جائے۔

جب پاویل واپس آیا اور تصویر کی تباہی دیکھی تو اس نے کاتیہ کو زیر لب سوٴرنی کہا تاکہ لیودوکیہ نہ سن لے۔ کاتیہ نے اس دوران میں تصویر کے باقی حصے پر بھی ہاتھ صاف کر دیا۔ اور جواب دیا: "تم خود سور ہو ماتنے بڑے۔"

۱۵

نتالیہ بھوسے کی پرچھتی پر سوتی تھی۔ کھڑکی سے جھانکتے ہوئے چاند اور

بھوسے کی خنک مہک کی ڈسراہٹ میں سونا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ وہاں لیٹ کر وہ مستقبل کے متعلق سپنے دیکھ سکتی تھی۔

ایک شام اس نے نیند بھگانے کے لئے ٹھنڈے پانی سے منہ دھویا تاکہ دیر تک اپنے خیالوں میں مگن رہ سکے پھر وہ سیڑھی چڑھ کر مچان پر گئی اور وہاں چاندنی کی روشنی میں اسے کھڑکی میں سگریٹ پیتا ایک ہیولیٰ نظر آیا۔ اس نے پاویل کو پہچان لیا اور اسے بے حد غصہ آیا۔

"بھوسے کے ڈھیر پر سگریٹ پی رہے ہو۔ دیوانے تو نہیں ہو گئے؟"

"میں اسے انگلیوں سے بجھا دوں گا۔"

"نتالیہ کتابیں خریدنے کے لیے مجھے جو پیسہ ملا تھا وہ میں نے سب خرچ کر ڈالا۔"

"بکواس، یہ کیسے ممکن ہے؟"

پاویل ان الفاظ کا برا مان گیا۔

"میں بکواس کر رہا ہوں؟"

نتالیہ نے اسے غور سے دیکھا۔ کچھ عرصہ پہلے وہ ایک چھوٹا سا لڑکا تھا اور اب دیکھو۔ ایک نوجوان بھوسے کے ڈھیر پر بیٹھا سگریٹ نوشی میں مصروف تھا اور چندے کا پیسہ اپنے ذاتی مصرف میں لاتا تھا۔ اس نے تشریح کی۔ اس سے کہا گیا تھا کہ کاپیاں خریدنے کے لئے چندہ جمع کرے۔ پیسہ اکٹھا کر کے اس کا ارادہ تھا کہ استانی کو دیدے گا۔ مگر استانی اس روز آئیں نہیں گھر آتے ہوئے کاغذ قلم کی دوکان پر پنسلیں خریدنے کے لئے ٹھٹھکا۔ وہاں بڑھیا قسم کا دبیز کاغذ اور رنگ بک رہے تھے۔ دونوں بہت کمیاب اشیاء تھیں اور کل تک ممکن ہے فروخت ہو جاتیں۔ چنانچہ اس نے چندے کے روپے سے سارا

مال خرید لیا۔

دوسرے روز اسکول جانے کے بجائے وہ آوارہ گردی کرتا رہا اور سوچتا رہا کہ پیسہ کہاں سے فراہم کرے۔ اپنی کتابیں بیچنے کی کوشش کی لیکن ان کی قیمت صرف ڈیڑھ روبل لگی۔ سارے دوستوں سے قرض مانگا اور اب تک صرف ایک روبل اور ساٹھ کوپک جمع کر سکا تھا۔

"اب کتنے اور روبل چاہییں؟" نتالیہ نے دریافت کیا۔

"سولہ۱۶"

دونوں اتنی کثیر رقم کے بوجھ تلے دب کر خاموش ہو گئے۔

"نتالیہ میں اپایا اماں سے تو کہہ نہیں سکتا۔ مجھے پتا ہے وہ مجھے روپیہ دے دیں گے مگر میرا جی نہیں مانتا۔ میں اُن کو یہ نہیں بتا سکتا کہ میں نے امانت میں خیانت کی ہے، میں اتنا ذلیل ہوں کہ میرے لئے بہترین راستہ اب یہی ہے کہ خودکشی کر لوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیسے ہوا، لیکن جب میں پکڑا جاؤں گا تو اس کے بعد میرا زندہ رہنا محال ہو گا۔ اور میں مرنا بھی نہیں چاہتا۔"

اتنا بڑا ہو گیا یہ لڑکا! اور بدشکل بھی نہیں ہے۔ خوب صورت پیشانی اور نرم آواز۔ اور مرنے کی باتیں کرتا ہے! نتالیہ کو ایک عجیب، انوکھے شیریں سے احساس نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اسے ڈر سا لگا اور وہ خاموش رہی کہ اس کی آواز اس کے ساتھ غداری نہ کرے۔

"بھئی تم بھی کتنی عجیب ہو نتالیہ" پاویل نے صدمے سے کہا "میں نے تم کو اپنا سارا احوال سنا دیا اور تم بات ہی نہیں کرتیں۔" اس نے یہ ظاہر کیا گویا اٹھ کر چلا جائے گا۔

"ٹھہرو پاویل۔ مجھے سوچ لینے دو" نتالیہ نے آہستہ سے کہا "خودکشی

مت کرو۔ تم ذلیل بھی نہیں ہو۔ کیونکہ تم نے اپنی غلطی محسوس کر لی ہے میرے پاس بارہ روبل ہیں مجھے ابھی اپنے وظیفے کی رقم ملی ہے تمہارے پاس بھی کچھ روبل موجود ہیں۔ کل رقم واپس کر دو۔ مگر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو، سمجھے؟ لیکن اگر آئندہ تم نے ایسا کیا تو سب سے پہلے میں تمہارے اسکول جا کر تم کو پکڑوا دوں گی سمجھے؟"

"کمال کرتی ہو، میں دوبارہ ایسا کام کیوں کروں گا؟ دیکھو تو سہی میں نے طے کر لیا تھا کہ جا کر دریا میں ڈوب جاؤں اور میں صرف تم ہی سے یہ بات کہہ سکتا تھا۔"

پھر رونے لگا حالانکہ اسے آنسو بہاتے بڑی شرم بھی آ رہی تھی۔ نتالیہ نے یہ ظاہر کیا کہ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہے۔ وہ چاندنی رات میں آسمان پر بہتے ہوئے روپہلی بادلوں کو تکتی رہی اور خود اپنے آنسو پینے کی کوشش کرنے لگی جو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

"تم یہاں سو سکتے ہو۔" بالآخر اس نے پاویل سے کہا۔ "یہاں بڑی سہانی نیند آتی ہے پاول۔"

اپنے آنسوؤں اور اپنے جذبات کے بوجھ سے تھک کر وہ بھوسے کے ڈھیر پر پاس پاس پڑ کر سو رہے۔ جب صبح سویرے اُن کی آنکھ کھلی۔ روپہلے بادل اس وقت بھی مچان کی کھڑکی کے پاس سے گزر رہے تھے۔

۱۶

ایک خوش شکل نوجوان نے باقاعدگی سے نتالیہ کو کالج سے گھر پہنچانا شروع کر دیا یلو دوکیہ کی دو مرتبہ اس لڑکے سے نتالیہ کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ نتالیہ

اس قدر سرد مہری اور خود اعتمادی سے راستہ طے کرتی تھی کہ کوئی نوجوان نتالیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ساتھ ساتھ چلنے کا خواب بھی نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس وجہ سے یہ لڑکا بڑا مؤدبانہ۔ فاصلہ رکھتے ہوئے نتالیہ کے ہمراہ آ رہا تھا اور بہت جوش و خروش سے نتالیہ کو کچھ بتاتے ہوئے زور زور سے اپنے ہاتھ ہلانے میں مصروف تھا۔ ایک بار تو اس نے مارے جوش کے اپنی ٹوپی بھی ہوا میں اچھالی اور پھر پھرتی سے پکڑ لی۔ یودوکیہ کو یہ لڑکا پسند آیا۔ وہ بہت بھولا اور نوعمر تھا۔ نتالیہ اسے ابھی اخلاقی حدود سے تجاوز نہ کرنے دے گی اور خود یودوکیہ اپنی بیٹی کو اس قسم کی آزادی کی اجازت نہ دے گی۔ لیکن اگر اس کی شادی ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔

وہ نتالیہ کے ساتھ زیادہ شفقت سے پیش آنے لگی تاکہ لڑکی اسے اپنا رازدار بنانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کرے۔ ساتھ ہی یودوکیہ دھیان سے یہ بھی دیکھتی رہی کہ نتالیہ اداس یا اعصابی اور جذباتی لحاظ سے مضطرب تو نہیں ہو گئی ہے۔ نتالیہ گہری سوچ میں تو اکثر ڈوبی رہتی مگر جذباتی انداز میں مضطرب کبھی نظر نہ آئی۔ نہ اس نے اپنے دل کے راز بتانے کا کوئی ارادہ ظاہر کیا۔ وہ اطمینان سے کالج جانے اور جرمن زبان کا مطالعہ کرنے میں مشغول رہی۔

ایک دن نتالیہ کی عدم موجودگی میں دروازے کی گھنٹی بجی۔ وہ نوجوان اخبار کے کاغذ میں لپٹا گلدستہ لئے سامنے کھڑا تھا۔ "یہ نتالیہ کو دیجئے گا۔"

اتنا کہہ کر وہ فوراً بھاگ گیا۔

یودوکیہ نے گلدان میں سے نقلی پھول نکال کر نوجوان کے لائے ہوئے تازہ پھول سجا دیئے۔ جب نتالیہ گھر آئی تو یودوکیہ نے کہا "دیکھو تمہارا نوجوان کیا لایا ہے۔"

"میرا دوست؟" نتالیہ نے تعجب سے دہرایا اور پھر زور سے ہنسی۔
"اوہ ولاڈی میر، وہ میرا نوجوان ہرگز نہیں ہے۔"
"مجھے پتہ ہے کہ تم اٹھارہ سال کی ہونے سے پہلے رجسٹرار کے دفتر نہیں جاسکتیں لیکن ایک آدھ سال انتظار کرسکتی ہو۔ اتنا اچھا لڑکا ہے۔"
"میں تو سال پھر کیا پانچ سال بعد بھی اس سے بیاہ نہیں کروں گی۔ وہ محض میرا دوست ہے اور بس۔"
یودوکیہ کو نتالیہ کی بات ناگوار معلوم ہوئی۔ "تم بڑی گھنی ہو لڑکی۔" اس نے کہا "لیکن تم مجھے جل نہیں دے سکتیں، کوئی معمولی دوست پھول لے کر آئے گا؟ ذرا تم دیکھتیں تو سہی کہ مجھے گلدستہ تھما کر کیا سرپٹ بھاگا۔ بڑی آئیں بچاری۔ میرا محض دوست ہے۔"
"ٹھیک ہے اماں۔" نتالیہ نے دوسری طرف مڑ کر پھولوں کو سونگھتے ہوئے جواب دیا (حالانکہ سب جانتے ہیں کہ گل داؤدی میں خوشبو نہیں ہوتی)۔ "کہیں اگر کوئی شخص پھول لانے کے بعد سرپٹ بھاگ جائے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ اس سے شادی کرلی جائے۔ یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اماں۔ مجھے معاف کردینا۔" اس نے اپنا تمتمایا ہوا چہرہ پھولوں میں چھپاتے ہوئے کہا۔
"مگر میں اس معاملے کا تذکرہ نہیں کرنا چاہتی۔ برا نہ ماننا اماں۔"
بس بات ختم ہوگئی۔ اب یودوکیہ کیا کہتی؟ اتنا بھلا، معقول لڑکا، ایسا خوبصورت گلدستہ، اور لڑکے کا نام بھی کتنا اچھا تھا ـــــ ولاڈی میر اور صاحبزادی اس معاملے کا تذکرہ نہیں کرنا چاہتیں۔ بہت اچھے۔ کیا زمانہ آن لگا ہے۔ آخر لڑکی چاہتی کیا ہے؟ اپنی زندگی کا مقصد اس نے کیا سوچا ہے اور کہیں وہ مقصد ایسا تو نہیں جو اس کی پہنچ سے باہر ہو اور اسے تباہی اور

مصیبت کے راستے پر نے جائے؟ خدایا میری بچی کا نصیب اچھا کر، اُسے سکھی رکھ، اس کی ساری تمنائیں بر آئیں۔ آمین۔

۱۷

ایک شام — یہ پہلے پانچ سالہ منصوبے کے پہلے سال کا ذکر ہے — آندرے کام کے بعد گھر واپس نہیں آیا۔ گھر والوں نے کچھ دیر اس کا انتظار کیا پھر رات کا کھانا شروع کر دیا۔ یہ پہلی بار ایسا نہیں ہوا تھا کہ وہ رات کو دیر سے آئے۔ وہ اکثر اپنے دوستوں کے ساتھ گھومنے چلا جاتا تھا مگر آج شام یودوکیہ بہت گھبرا رہی تھی۔ اسے ایک انجانے سے خطرے کا احساس ہو رہا تھا اور اس چیز کو یودوکم نے بھی محسوس کر لیا۔

رات بھر دونوں میاں بیوی آندرے کے انتظار میں دروازے پر کان لگائے بیٹھے رہے۔ کمرے میں حبس طاری تھا اور لیمپ کے چاروں طرف پتنگے بھنبھنا رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں بادل گرجنے لگے اور بارش کا ریلا آگیا۔ بارش ختم ہوئی تو یودوکم نے دریچہ کھولا اور پانی میں بھیگی تازہ تازہ ہوا کمرے میں پھیل گئی۔ نالیوں میں برساتی پانی کی ندیاں بہ رہی تھیں اور صبح ہونے والی تھی۔ اتنے میں دروازے پر زور سے دستک ہوئی، یودوکیہ اٹھ کر جانے لگی مگر یودوکم نے اسے روک لیا "میں دیکھتا ہوں ٹھہرو"

بھاری بھاری قدموں سے جا کر اس نے دروازہ کھولا، یودوکیہ اس کے پیچھے پیچھے آئی اور اس کے بازو کے اندر سے جھانکنے لگی۔ لڑکیوں کا غول باہر بارش میں کھڑا تھا۔ سب خاموش تھے۔ پھر ایک لڑکا جس نے اپنی پتلون کے پائینچے

الٹ کر گھٹنوں تک چڑھا لئے تھے، آگے بڑھا اور اپنا سگریٹ برساتی گڑھے میں پھینک کر بولا "یودوکم نکولائی وچ، ایک حادثہ ہو گیا ہے"۔

"آندرے زندہ تو ہے؟"

لڑکے خاموش رہے، افق پر صبح کا اجالا پھیل رہا تھا اور برساتی پانی نالیوں میں بہے جا رہا تھا۔

آندرے اپنے تابوت میں لیٹا تھا جو اس کے لئے بہت بڑا تھا۔ اس کے سر کا جتنا حصہ سلامت بچا اس پر ململ بندھی تھی اور پھول پڑے تھے۔ یودوکم تابوت کے سرہانے کھڑا سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ کیا ہو گیا۔

آندرے حسب معمول ٹرین میں کارخانے سے واپس آ رہا تھا اور ٹرین رکنے سے پہلے اپنے ساتھیوں سے قبل ہی کود پڑا تھا۔ یہ ایک واقعہ تھا کہ خوامخواہ کی بہادری کی عادت اس میں ہمیشہ سے تھی۔ وہ سیڑھی پر سر کے بل گرا اور اس کا سر کچل گیا اور جب ایمبولنس آئی تو ڈاکٹر نے کہا کہ وہ ختم ہو چکا ہے۔ ساتھیوں نے کومسومول کمیٹی اور مقامی سرکاری وکیل کو فون کیا کہ ان کے کامریڈ کو فوراً ہسپتال پہنچایا جائے۔ لیکن مردہ خانے میں اس کی اکڑی ہوئی اور سخت لاش دیکھنے کے بعد ہی ساتھیوں کو یقین آ سکا کہ آندرے ان سے چھوٹ گیا ہے۔ اس آندھی اور طوفان میں رات بھر سڑکوں پر مارے مارے پھرتے وہ یہ طے کرنے میں مصروف رہے تھے کہ ان میں سے کون آندرے کے والدین کو یہ منحوس خبر سنائے۔ چونکہ کوئی بھی یہ المناک فرض اپنے ذمے لینے کے لئے تیار نہ ہوا اس لئے وہ سب کے سب ایک ساتھ آ گئے تھے۔

اور اب وہ تابوت میں لمبا لمبا لیٹا تھا۔ اس کا اب کوئی چہرہ نہ تھا، وہ جوان ہو چکا تھا، دوسرے لوگ اس کا ذکر اس طرح کر رہے تھے جیسے وہ ان

کا ہمسر ہو۔ کارخانے کا عملہ اس کو دفنانے کے لئے آیا۔ پرانی وضع کی صدریوں میں ملبوس بوڑھے اور بڑھیاں، پھولوں کے ہار سنبھالے لڑکیاں اور "ینگ پائنیرز" میں شامل سرخ رومال والے بچے، اس کے جنازے کے ساتھ تھے۔ جنازے کے پیچھے بینڈ تھا۔ اور اس کے بعد سرخ جھنڈے۔ شیسٹکن کے رنج و الم کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا اور کاتیہ بری طرح سسکیاں بھر رہی تھی۔

یودوکیہ نے سب کے سامنے ایک آنسو تک نہیں بہایا، بلکہ شیسٹکن اور کاتیہ کو اپنے بھر دلاسا دینے کی کوشش میں لگی رہی۔ لیکن جب وہ گھر آئی اور ایک کرسی کی پشت پر آندرے کی جیکٹ پڑی دیکھی، اس کے منہ کی چبائی ہوئی پنسل اس کی جیب میں نظر آ رہی تھی، تو یودوکیہ کا سر میز پر گر گیا اس نے کراہ کر آنسوؤں کے راستے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

بہت عرصے تک آندرے کی چیزیں دیکھ کر اس کے دل پر چھریاں چل جاتی تھیں۔ بینڈ کا ماتمی راگ اس کے کانوں میں بے رحمی سے گونج اٹھتا۔ لیکن اس کا دل سب سے زیادہ اس وقت پھٹتا جب وہ آندرے کی آمد کا پہلا دن یاد کرتی۔ کس طرح یودوکم ایک آوارہ گرد لونڈے کو لے کر آیا تھا اور اس سے کہا تھا کہ اسے نہلائے اور وہ خون آلودہ میلا چہرہ دھلنے کے بعد ایک معصوم بچے کے پیارے پیارے نقش و نگار جگمگا اٹھے تھے۔

کیا یہ اس کا قصور تھا؟ شاید اس نے آندرے کی دیکھ بھال میں کمی کر دی تھی؟ کیا ایسا ممکن تھا کہ وہ کوئی ایسی بات کرتی یا کہتی جس کی وجہ سے یہ حادثہ پیش نہ آتا۔ کیا کوئی نصیحت یا لفظ اس المیے کو روک سکتا تھا؟ اس نے آندرے کی خبر گیری میں کوتاہی برتی تھی اور اب وقت گزر چکا تھا ــــــ

۱۸

یودوکیہ بازار جاتے وقت حسب معمول ننھے ساشا کو ساتھ لیتی گئی۔ وہ اسے تھوڑی دیر کے لئے بھی اکیلا چھوڑنے سے خائف تھی کیونکہ وہ بڑا ہو کر بے حد ضدّی اور شریر ہو گیا تھا۔ وہ ساشا کے لئے ہر وقت متفکر رہتی تھی خصوصاً اس وجہ سے کہ وہ ایک غیر معمولی طور پر خوبصورت لڑکا تھا۔ یودوکیہ کو ڈر تھا کہ کوئی اسے اغوا نہ کرے۔ دونوں ماں بیٹے جوتے والے اور بزاز کی دوکان پر گئے۔ پھر ایک دوکان سے انھوں نے پیسٹری خریدی۔ ساشا نے کیک کھا لیا مگر اسے کریم ناپسند تھی۔ لہٰذا کریم یودوکیہ نے کھائی۔ اس کے بعد انھوں نے اپنا اپنا وزن لیا، شربت پیا، اور نیلے رنگ کا اونی بھالو خریدا۔ ساشا بھالو اٹھانے پر آمادہ نہ ہوا لہٰذا یودوکیہ نے کھلونا بھی سنبھالا۔ دونوں بہت تھک گئے تھے اور گھر جاتے ہی ساشا، یودوکیہ کے پلنگ پر گر کر 'پٹ' سے سو گیا۔ یودوکیہ نے اس کے جوتے اتار دے، ایک تکیہ اس کے سر کے نیچے رکھا اور کھانا پکانے میں جٹ گئی۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی اور وہی عورت جو ایک بار پہلے آئی تھی، اندر داخل ہو گئی۔

اس دفعہ اس کے بالوں میں گھونگھر نہیں بنے تھے اور اس نے اونچی ایڑی کی جوتیاں بھی نہیں پہن رکھی تھیں، اس نے بڑی لجاجت سے کچھ خیرات مانگی۔ یودوکیہ نے اس سے دروازے کے پاس والی کرسی پر بیٹھنے کو کہا اور پنیر اور دودھ پیش کیا۔ عورت کو کھانے کی جلدی نہیں معلوم ہوتی تھی اور وہ بھوکی نظر بھی نہیں آرہی تھی۔ وہ موٹی تازی عورت تھی۔ اور اس کے رخسار مارے صحت

کے سرخ ہو رہے تھے۔ صرف اس کے کپڑے بوسیدہ اور میلے تھے۔ یودوکیہ نے اس سے پوچھا: "تم کہیں کام نہیں کرتیں۔ ہٹی کٹی ہو، بھیک مانگتے اچھا لگتا ہے؟"

عورت اس سوال سے مطلق نہیں جھینپی۔

"تم بھی تو کام نہیں کرتیں۔"

"میں اپنے پانچ جانوں کے کنبے کے لئے پکاتی ریندھتی ہوں، کپڑے دھوتی ہوں۔ سلائی کرتی ہوں، اپنے شوہر اور چار بچوں کی دیکھ بھال ہی میری محنت اور میرا صلہ ہے۔"

"مگر یہ تمہارے اپنے بچے تو نہیں ہیں۔ عورت نے طنزاً کہا۔ یودوکیہ ساکت کھڑی ہو گئی، تنور کا چمٹا اس کے ہاتھ میں تھا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" اس نے کہا۔

"لے پالک بچے، جنا کسی اور نے اور بچہ امّاں تم کو پکارے! پھر دودھ ایک ہی سانس میں نٹرک جانے کے بعد عورت نے سوال کیا۔ "تم نے کیا کیا ہے جس کے صلے میں تم ان سب کی اماں بن گئیں؟" اس نے دودھ کا گلاس صندوق پر پٹک دیا: "تم نے ان کی خاطر زچگی کی تکلیف نہیں اٹھائی اور اب تم پنیر کے کیک کے ذریعے میرا منہ بند کرنا چاہتی ہو۔"

اس نے کیک یودوکیہ کے قدموں میں پھینک دیا۔ اپنی شکستہ شال اتاری اور ایک ٹوکاری لی۔ تب جا کے یودوکیہ کو پتہ چلا کہ عورت نشے میں تھی۔

"کتنی کائیاں ہو تم، اب سیدھی طرح سے ایک سو روبل نقد دیدو، پھر دیکھا جائے گا۔ لیکن شاید میں یہ رقم بھی منظور نہ کروں"۔ عورت نے کہا۔

"تم کو ایک سو روبل کس خوشی میں دیدوں؟" یودوکیہ نے پوچھا۔

"بی بی بنو ایسی ننھی بھی نہ بنو میرے سامنے"۔ عورت نے چلچلا کر کہا۔

"تو ٹروبل دیدو مجھے سیدھے ہاتھ سے۔ ورنہ میرا بیٹا مجھے واپس کرو سمجھیں؟ چار سال سے تم نے میرا بچہ اپنے پاس رکھا ہوا ہے، اب پنیر کیک کھلا کر مجھے بھگتا دینا چاہتی ہو ارے واہ رے میری بنو۔"

یودوکیہ نے چمٹا اپنی جگہ پہ رکھ کر مختصر سی آہ بھری۔

"میں لڑ کا لے جاؤں گی اور تم کچھ نہ کر سکو گی۔ میرے پاس اس کی پیدائش کا سرٹیفکٹ موجود ہے۔"

"بچے پر اب تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔ اور ایک آوارہ عورت کا بچہ کوئی واپس نہ کرے گا۔"

"یہ بھی دیکھا جائے گا۔ دیکھوں تو سہی تم اسے کیسے واپس نہیں کرتیں۔"

"تم نے خود ہی اسے چھوڑ دیا تھا۔"

"نہیں میں اس وقت ہسپتال سے نکلی تھی اور میرے ہوش وحواس قائم نہ تھے۔ میں نے اسے تمہاری دہلیز پر پل کے لئے رکھ دیا تھا تاکہ ایک طرف کو جا کر رفع حاجت کر لوں۔ جب واپس آئی تو وہ غائب ہو چکا تھا۔"

"تم جھوٹی ہو۔ تم نے خود بچے کو جان بوجھ کر وہاں ڈالا تھا۔"

"جھوٹی تم خود ہو۔ تم نے میرا بچہ چرایا۔ میں عدالت میں ثابت کر سکتی ہوں، گواہ کھڑے کر سکتی ہوں تم بانجھ عورت ہو جو دوسروں کے بچوں پر قبضہ جما لیتی ہو تاکہ ان سے اپنی چاکری کرواؤ اور خود مزے سے بیگم بن کر بیٹھو۔ لیکن ہماری پرولتاری عدالت فیصلہ کر دے گی۔" اس نے فتح مند آواز میں چلاتے ہوئے کہا۔ "پرولتاری عدالت تمہارا سارا پول کھول دے گی۔ ——— جونک ———!!"

عین اسی وقت پاویل اسکول سے گھر لوٹا اور یہ عجیب وغریب جھگڑا

سنتے ہی وہ ہکا بکا رہ گیا۔

"پاویل" یودوکیہ نے کہا "تم یہیں ٹھہرو۔ کمرے سے باہر نہ جانا" پھر وہ پلنگ کمرے میں گئی۔ ساشا گہری نیند سو رہا تھا اور اس کا ننھا سا منہ کھلا ہوا تھا۔ اس کا مضبوط، دھوپ میں تمتمایا ہوا بدن اس کی نیکر اور موزوں کے درمیان سے نظر آ رہا تھا۔ اونی بھالو اس کے پہلو میں پڑا تھا۔

یہ خیال ہی قیامت خیز تھا کہ ساشا اس شرابی عورت کو واپس کر دیا جائے جو اس سے گلیوں میں بھیک منگوائے گی اور اس پر طرح طرح کے ظلم توڑے گی۔ یودوکیہ نے دو زانو۔۔ بیٹھ کر صندوق کھولا اس کی تہہ میں رومال کے اندر لپٹی ہوئی وہ رقم رکھی ہوئی تھی جو اس نے یودوکم کا نیا سوٹ بنانے کے لئے بچائی تھی۔ نتالیہ کی شادی میں پہننے کے لئے یودوکم کو نیا سوٹ چاہیے ہوگا۔ پرانا سوٹ گھس چکا تھا۔ وہ اپنے شوہر سے چھپا کر گائے کا دودھ بیچتی رہی اور اس کا پیسہ جوڑ جوڑ کر یہ رقم جمع کی تھی۔ اس نے سو روبل گنے اور باورچی خانے میں واپس آئی۔

"رقم کی رسید لکھ دو —— پاویل بیٹے۔ ذرا قلم دوات لانا" پیسے کی شکل دیکھ کر عورت بہت خوش نظر آئی۔

"مجھے لکھنا اچھی طرح نہیں آتا۔ اس نے بڑی ملائمت سے جواب دے کر قلم ہاتھ میں لے لیا۔ یودوکیہ اور پاویل قریب کھڑے اس کو دیکھتے رہے۔

"اور لکھو — کہ تم بچے کے سلسلے میں اپنے سارے حقوق سے دستبردار ہوتی ہو کہ تم اس کی ماں نہیں بلکہ سانپ ہو"

عورت نے لکھنا ختم کر کے بڑی شان سے اپنے دستخط کیے۔ اناشتکا پیدر' یودوکیہ نے رسید ریشمی رومال میں لپیٹ کر صندوق کی تہہ میں رکھ دی۔

۱۹

ڈگری حاصل کرنے کے بعد نتالیہ اوزار بنانے کے کارخانے میں ملازم ہو گئی۔ وہ تین چار سال وہاں کام کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے ٹیکنالوجی کے کسی انسٹی ٹیوٹ میں جانا چاہتی تھی۔ لیکن دفعتاً اس نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا اور امور دریا کے کنارے آباد ہونے والے ایک نئے شہر کے معماروں میں اپنا نام لکھا لیا۔

"دو غیر زبانیں سیکھنے کا کیا فائدہ ہوا؟" یودوکیہ نے جو نتالیہ کے جانے کی اطلاع سے اداس تھی، کہا "۔ اگر کسی ویرانے میں جا کر درخت اکھاڑنے اور اینٹ گارا ڈھونے کا ارادہ تھا تو جرمن اور انگریزی کیوں پڑھی؟"

نتالیہ ان الفاظ پر مسکرا کر رہ گئی۔ بہت جلد وہ کومسومول لڑکوں لڑکیوں سے بھری ہوئی ایک ٹرین پر سوار ہو کر خدا جانے ملک کے کون سے دور دراز گوشے کی طرف روانہ ہو گئی۔

پاویل کا ارادہ آرٹسٹ بننے کا تھا اس نے اپنے ماں باپ یا دوستوں سے اس ارادے کا تذکرہ نہیں کیا کہ کہیں وہ لوگ اس کا مذاق نہ اڑائیں۔ اس سلسلے میں اس کے اسکول کا ڈرائنگ ٹیچر نکولائی لیودوِچ جو عجیب مسخرے پن کے بلاؤز پہنتا تھا، اس کا واحد رازداں تھا۔ اس کی مونچھیں بھی انوکھی تھیں اور شاگردوں سے بات کرنے کے انداز پر اسکول کے منتظمین نے بارہا اس کی فہمائش کی تھی۔ "یہ احمق الذی کیا بنانا چاہتا ہے۔ کیوں؟" وہ کوئی خراب تصویر دیکھ کر اچانک طالب علم سے سوال کرتا۔ یا آرٹ پر مندرجہ ذیل

انداز سے تقریر کرتا۔

"اماں اپنی آنکھیں استعمال کرو آنکھیں۔ یہی آرٹسٹ کا اولین اوزار ہیں۔ اس کے بعد پنسل اور برش۔ کسی شے کو دیکھتے وقت کوشش کرو کہ پلکیں نہ جھپکیں۔ ایک پتی کو سورج کے سامنے کر کے اس کا مطالعہ کرو۔ اس کی ایک ایک رگ ذہن نشین کر لو۔ ہر پتی اپنی جگہ پر انوکھی ہے۔ محض فوٹوگرافر نہ بنو۔ جو لوگ فطرت کی جھوٹی نقالی کرتے ہیں، یا اس کے بُرے عکس اتارتے ہیں ان کو گولی سے اڑا دینا چاہیے۔ فوٹوگرافی کرنے کے بجائے چیزوں کی اندرونی کیفیت کو سمجھو تاکہ ایک لازوال فن پارہ تخلیق کر سکو۔ جو پتا تم نے ابھی دیکھا وہ مرجھا جائے گا مگر تمہارا بنایا ہوا پتا امر رہے گا۔ مجھے ایک شبہ ہے کہ کنواری مریم امر ہیں یا کبھی موجود بھی تھیں یا محض افسانہ ہی ہیں۔ مگر رافائیل کی بنائی ہوئی کنواری مریم یقیناً لافانی اور امر ہے کیونکہ جو شخص تخلیق کرتا ہے، وہ موت پر فتح پالیتا ہے۔ روشنی اور تاریکی، سخت اور سیال اشیا کی تفریق پر دھیان دو۔ اگر ایسا نہیں کر سکتے تو آرٹ کو بخشو، کہیں جا کر بھنگی بن جاؤ۔"

"حسن کیا ہے ــــ؟" وہ تقریر جاری رکھتا ــــــ "کہا جاتا ہے کہ گھنگھریالے بال حسن ہے اور گنجا پن بدصورتی۔ میں کہتا ہوں کہ گنجا سر حسن کا نمونہ ہے کہ کھوپڑی کے شاندار گنبد کو اجاگر کرتا ہے اور ذہین اور پُرافتخار پیشانی کو ہویدا کرتا ہے (میں احمقوں کے گنجے پن کی باتیں نہیں کر رہا ہوں) صرف وہ چیز خوبصورت ہے جس میں ذہن اور خیال مضمر ہے یا جسے ذہن اور خیال عطا کیا گیا ہے۔ میں اس حسن کاری پر لعنت بھیجتا ہوں جس سے خیال پراگندہ ہو اور ذہن دھندلا ہو جائے۔ حسین ترین تصویر اگر ذہن کے عکس سے عاری ہے تو اسے غسلخانے میں لٹکا دینا چاہیے۔"

"لیکن بچوں سے اس طرح بات کرنا مناسب نہیں"۔ دوسرے استاد غصے کے ساتھ اس سے کہتے"۔ وہ اس طرح کی گفتگو خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں" نکولائی لیوودوچ جواب دیتا۔" اور وہ لوگ جن کے سروں میں مغز کے بجائے بھوسا بھرا ہے انھیں کچھ سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں"۔

لیکن واقعہ یہ تھا کہ اس کے شاگرد اس کو سمجھتے تھے اور جس انداز سے وہ اس سے باتیں کرتا تھا اس پہ نازاں بھی تھے۔

اس سنکی اور خبطی استاد کو پاویل نے اپنے ارادوں سے مطلع کیا۔ نکولائی لیوودوچ نے غور سے ساری بات سن کر بڑے حقیقت پرست لہجے میں جواب دیا" ٹھیک ہے اسکول کے بعد تم اکیڈمی آف آرٹ کے لئے ٹکٹ کٹا ڈ"۔

"نکولائی لیوودوچ۔ آپ کا خیال ہے میں آرٹ کی دنیا میں کچھ کر سکوں گا"۔

"ہاں"۔ استاد نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"مجھے کوئی کام دیجئے"۔ پاویل نے کہا۔ وفور مسرت سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

"کام ——؟" نکولائی لیوودوچ نے کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور کہا" تمھارے والد کروڑی لینخا میں کام کرتے ہیں نا؟ تم نے وہ جگہ دیکھی بھی ہے؟"

"جی ہاں، کئی مرتبہ"۔

"اچھا تو اس جگہ کی ایک تصویر بنا کر لاؤ"۔

یہ بڑی آسان بات تھی۔ پاویل وہاں گیا، شسٹرکن کے گھر کی چھت پر سے گردوپیش کا جائزہ لیا اور تصویر بنانے میں جٹ گیا۔

"کیسے جاؤ کوشش مرے دوستو ——!" شسٹرکن نے للکار کر کہا۔

"بوڑھی اماں کروڑی لیخا کی تصویر بنا کر دو ہمیں!"

گھر واپس آکر پاویل نے خاکے میں آبی رنگ بھرے اور چمنیوں میں سے نکلتے دھوئیں پر خاص طور سے توجہ دی۔ آسمان کو شفق کے رنگوں سے مزین کیا۔ اور تصویر لے کر بھاگا بھاگا استاد کے پاس پہنچا۔

"یہ کیا شئے ہے؟" نکولائی لیو دوچ نے استہزا سے دریافت کیا۔

پاویل کا دل ڈوب گیا۔

"آپ نے کہا تھا ——"

"ہاں میں نے کروڑی لیخا کی تصویر بنانے کے لئے کہا تھا چمنیوں کے ڈھیر کی نہیں۔"

"لیکن یہ ——"

"بکواس — اور یہ شفق یہاں کیا کر رہی ہے؟ تاکہ منظر خوب صورت لگے؟" استاد نے تصویر ایک طرف کو پھینک دی "کوئی بھی فوٹو گرافر یہ منظر اُتار کر لا سکتا ہے۔ کروڑی لیخا غروب آفتاب کے وقت، چاندنی رات میں، جاڑوں میں، گرمیوں میں ——"

پاویل نے تصویر اٹھائی جواب بے حد نفرت انگیز معلوم ہو رہی تھی اور دل شکستہ، شرمندہ، یہ سوچتا ہوا واپس لوٹا کہ کروڑی لیخا کی کیسی منظر کشی کرے جس کو دیکھ کر استاد انعام دے ڈالیں۔

سردیوں بھر پاویل کروڑی لیخا جاتا رہا۔ شیسٹرکن کو لڑکے کی صحت کی طرف سے فکر ہوئی۔ سرد ہواؤں کے تھپیڑوں میں پاویل کا چھت پر طویل گھنٹے گزارنا مذاق کی بات نہیں تھی۔ پاویل کارخانے کے اندر بھی جاتا جہاں سینکڑوں مشینیں اور بوڑھے اور جوان کاریگر کام کر رہے تھے۔ وہ ان کے خاکے

بناتا اور پھاڑ ڈالتا۔ مشینیں بھی ٹھیک تھیں، انسان بھی۔ لیکن کسی ایک چیز کی کمی تھی۔ اس کے پاس اسکول جانے، کھانے پینے کا وقت نہ تھا۔ وہ ایک جنون اور بدمزاجی کی کیفیت میں کام کر رہا تھا۔ کروڑی لیبا اس کو چور چور کئے ڈال رہا تھا۔ رات کو بھی وہ کارخانے کے خواب دیکھتا جس کے چپے چپے سے وہ اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ ان گنت بار دُہرائے جانے کی وجہ سے اس نام نے اپنی ساری معنویت کھو دی۔ یا ایک نئی معنویت اختیار کر لی۔ اب یہ ایک عورت کا نام معلوم ہوتا تھا، کروڑی لیبا ——— جس طرح اس نے بہت سی عورتوں کے نام سن رکھے تھے۔ کارنیجا – چیرانی شیخا۔ استیاپانیجا۔

پھر ایک سیدھا سادا خیال اس کے ذہن میں کوندا۔ جیسے کسی نے اندھیرے کمرے میں اچانک روشنی جلا دی ہو۔ اس کے ہاتھ لرزنے لگے اور حلق خشک ہو گیا۔ کتنی آسان بات تھی۔ کتنی آسان! لیکن اس کے دھڑکتے ہوئے دل نے کہا کہ یہی اصل چیز تھی۔ اصل چیز۔

وہ کروڑی لیبا کو عورت کے روپ میں پیش کرے گا۔ ایک شفیق، مضبوط، محنت کش عورت۔ مکمل تصویر اس کے ذہن میں آن موجود ہوئی۔ یہی وہ عورت تھی۔ کروڑی لیبا ——— نہ بوڑھی نہ جوان ——— کھلا، راستبازانہ چہرہ، بلند پیشانی، اپنے کام پر نظریں جمائے۔ ایک ہاتھ مشین کے سوئچ پر موجود، کہنیوں تک کھلا بازو۔ بازو کا ایک ایک رگ پٹھا زندگی سے معمور۔ ایسے ہاتھ دنیا کی ہر چیز تعمیر کر سکتے تھے۔ مضبوط شانے ہر بوجھ اٹھانے کے اہل تھے۔ اور ان شانوں کے پیچھے نیلے آسمان کے مقابل میں کروڑی لیبا کی دھواں اُگلتی چمنیاں ——— !

جب وہ شیسٹرکن کے گھر سے لوٹا تو برف پر چلنے کے بجائے گویا ہوا میں اُڑ رہا تھا۔ اب وہ اپنے تخیل کی آنکھوں سے ایک تفصیل دیکھ رہا تھا۔ رخسار

پر ایک لکیر جسے فکروں نے پیدا کیا تھا۔ کنپٹی پر سر کے رومال میں سے جھانکتی ہوئی بالوں کی لٹ۔ انگوٹھے کے نیچے مضبوط جلد ۔۔۔ وہ خوبصورت نہیں تھی۔ اور مصوّر کو حُسنِ محض کی تلاش بھی نہیں تھی۔ کوئی عورت اس سے محض ۔۔ خوبصورتی کا مطالبہ نہیں کرے گی۔ وہ کروژی لینا تھی۔

شیستر کن کے گھر سے لوٹتے وقت وہ برف پر چلنے کے بجائے گویا ہوا میں اڑ رہا تھا۔ اسے نمدے کے جوتوں کے بھاری پن یا برفیلی ہوا کے تھپیڑوں کا احساس نہیں ہوا۔ اس نے راہ گیروں پر دھیان نہیں دیا۔ ساری دنیا صرف خالص مسرت سے معمور تھی! بہت جلد اس نے خود کو اپنے گھر میں موجود پایا۔ پنسل اور دبیز کاغذ سنبھال کر اس نے بڑی احتیاط سے خاکہ بنانا شروع کیا تاکہ اپنے تخیل کو کاغذی پیرہن پہنانے میں ناکام نہ رہے۔ اسے معلوم نہیں ہوا کہ وہ اس قدر جلد نکولائی لیوووچ کے گھر کیسے پہنچ گیا، جہاں مضحکہ خیز گل مچھوں والا کنوارا بوڑھا چائے پینے اور توس پر سیب کا مُربّہ لگانے میں مشغول تھا۔ پاویل نے خاموشی سے خاکہ میز پر رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے؟" نکولائی لیوووچ نے چندھیا کر دریافت کیا۔

"کروژی لینا۔"

ایک تکلیف دہ دھچکے کے ساتھ اپنی اونچی اڑان سے وہ دفعتًہ زمین پر آگرا۔ اس کا جسم تکان اور سردی کی وجہ سے سیسہ ہو رہا تھا اور گرد آلود بلب میں سے نکلتی روشنی مہمل اور ناکارہ معلوم ہو رہی تھی۔ وہ منتظر رہا۔ نکولائی لیوووچ چپ چاپ اس کے اسکیچ کا مطالعہ کر رہا تھا۔ ایک نامعلوم کپکپاہٹ نے پاویل کے سارے جسم میں سرایت کرنے کے بعد اس کے دل کو دبوچ لیا۔ اس کا چہرہ پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ اگر انھوں نے کہہ دیا کہ یہ تصویر بے کار ہے تو پھر کبھی

برش اور پنسل کو چھو بھی نہ سکوں گا۔ ذرہ برابر تلخی کے بغیر، واضح اور سرد انداز میں اس نے سوچا۔

اتنے میں اسے ایک سسکی کی آواز سنائی دی۔ نکولائی لیوو وچ نے اپنا رخ دوسری طرف کر لیا تھا اور اس کے کندھے ہل رہے تھے۔

"نکولائی لیوو وچ ــــ کیا ہوا ــــ؟" پاویل نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

نکولائی لیوو وچ نے ایک چھاری رومال سے ناک سنکی۔

"یہ ٹھیک ہے پیر ئیشوف۔ یہ اصل کمال ہے عجیب و غریب، حیرت انگیز کمال، اسے دیکھ کر دل بھر آیا ہے۔ ابھی خاکے کو چند روز مکمل نہ کرو۔ اپنے خیال کا مکمل اظہار کرنے کے لئے کچھ عرصہ توقف کرو۔ چراغ کی یہ لو جو تمھارے اندر ہے تمہیں کہیں دھوکا نہیں دے گی۔ اس لئے جلدی نہ کرو۔ تم ایک روز یقیناً ایک بڑے آرٹسٹ بنو گے۔"

۲۰

ننھا ساشا ملاحوں پر عاشق تھا اور جہازوں والی تصویروں کی کتابیں ہی اسے بھاتی تھیں۔ ایک بار کاما اسٹیم شپ لائن کے ملاحوں کی وردیاں دیکھ کر وہ بے حال ہو گیا تھا، یودوکم نے اسے بتایا کہ یہ لوگ سمندر کا سفر نہیں کرتے تو ان ملاحوں میں اس کی ساری دلچسپی ختم ہو گئی۔ "یہ دریا سمندر میں جا کر کیوں نہیں گرتا؟" کاما کو دیکھ کر وہ اپنی چھوٹی سی آواز میں یودوکیہ سے سوال کرتا۔

"پتہ نہیں بیٹے۔ اپنے ابا سے پوچھو۔" وہ جواب دیتی۔

جب وہ سات برس کا ہوا تو یودوکیہ کو خیال آیا کہ بہار کے موسم کے لئے وہ اس کے واسطے ایک پتلون بنا دے ساشا نے اس سے بے حد التجائیں کیں تب وہ راضی ہو گئی کہ اس کے لئے ملاحوں والا لباس سی دے گی۔ جس روز اس سیلر سوٹ کی آخری پیمائش ہو رہی تھی، ساشا کی والدہ آ پہنچی اور تین سو روبل کا مطالبہ کیا۔ یودوکیہ نے اسے ایک کوپک دیے بغیر گھر سے باہر نکال دیا۔

پندرہ دن بعد عدالت کا سمن آن پہنچا۔ جج ایک بھوسلے، بے رنگ بالوں، پژمردہ آواز اور تیکھے انداز والا نوجوان تھا۔ جب وہ مدعی اور مدعا علیہ سے سوالات کرتا تو اس کی پیشانی پر بل پڑ جاتے گویا حیرت زدہ ہو کہ لوگ آخر آپس میں جھگڑتے کیوں ہیں؟ جج کے دائیں اور بائیں طرف ثالث اور پنچ بیٹھے تھے جن میں ایک موٹا سا چمکیلی آنکھوں والا مرد تھا اور ایک بھاری بھرکم، کھچڑی بالوں اور دہرے بٹنوں والی جیکٹ میں ملبوس عورت۔ اس عورت پر یودوکیہ نے اپنی ساری آس لگا رکھی تھی۔

پہلا مقدمہ ایک مطلقہ جوڑے کی جائداد کے متعلق تھا۔ جائداد ایک لکھنے پڑھنے کی میز اور ایک سلائی مشین پر مشتمل تھی "مگر کیا تم کو سلائی کی مشین چلانی آتی ہے؟" جج نے شوہر سے پوچھا اور سوال کرتے ہوئے بڑی تکلیف سے پیشانی سکوڑی۔ عدالت کے کمرے میں قہقہے گونج اٹھے اور جج نے اپنی گھنٹی بجائی۔

اس کے بعد ایک طولانی بحث شروع ہوئی کہ آیا چوکیدار نے اپنی عمارت کے کرائے داروں کا ایندھن چرایا ہے یا نہیں۔ گواہوں نے چوکیدار اور کرائے داروں کے متعلق اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا۔ بمرا اپنے ہاتھوں میں تھام کر جج بار بار دہراتا "مقدمہ سے اس بات کا قطعی سروکار نہیں، سوال کا جواب دیجیے۔" کارروائیاں دیکھتے دیکھتے یودوکیہ کے سر میں درد ہونے لگا اچانک سارے

کرائے دار زور زور سے پیر ٹپکتے کمرۂ عدالت سے باہر نکل گئے۔ اور میاں اور بیوی پیرنی شوف کی باری آئی۔ جن پر ایک دوسری عورت کے بچے پر غیر قانونی قبضہ کرنے کا الزام تھا۔

یودوکیہ اور یودوکم جج کے سامنے کھڑے تھے۔ اناّ شکاپیدر نزدیک موجود تھی۔ اس وقت وہ نشے میں نہیں تھی۔ اور سر پر اس نے ایک سرخ رومال باندھ رکھا تھا۔ عدالت کے پیشکار نے اکتائی ہوئی آواز میں بیان پڑھ کر سنایا۔ اس میں قانون کی مختلف شقوں اور "غیر قانونی" کے الفاظ اتنی بار دہرائے گئے تھے کہ یودوکیہ کا جی بیٹھ گیا۔ بیان کے خاتمے کے بعد جج صاحب یقیناً حکم دیں گے کہ ساشا کو اس کی ماں کی تحویل میں دیدیا جائے۔

آپ کا خاندانی نام کیا ہے؟" جج نے اناّ سے پوچھا۔

" شکاپیدر۔"

" یہ ہو ہی نہیں سکتا" جج نے اسی آواز میں کہا جس میں مدت مدید کا الم پوشیدہ تھا۔ "ایسا خاندانی نام ناممکن ہے۔ نام اسکی پیدر[1] ہوگا" اس نے قطعیت کے ساتھ بات ختم کی اور یودوکم کی سمت مڑا۔

یودوکیہ کو معلوم تھا کہ اس کا شوہر ذہین ہے اور زندگی کے متعلق بڑے معقول نظریوں کا مالک ہے۔ اگر وہ خداوند کریم اور اس کے اولیاء پر بھی یقین رکھتا تو دنیا کی ہر چیز کے بارے میں وہ اس کی ہم خیال ہوتی۔ یہاں عدالت میں اس نے اس قدر پر اعتماد اور کاروباری انداز میں بات کی کہ اگر کمرے میں اجنبی موجود نہ ہوتے تو وہ مارے ممنونیت کے اس سے لپٹ جاتی۔ یودوکم نے

---

[1] روسی زبان میں اسکی پیدرا تارپین کو کہتے ہیں

عدالت کو بتایا کہ ساشا ان کو کس طرح ملا، یودوکیہ نے کس طرح اسے بوتل کا دودھ پلا کر زندہ رکھا، کس طرح اس کی طویل علالت میں اس کی تیمارداری کی، اس کے بال بنائے اور اس کی نگہداشت کی۔ اس نے کہا کہ ساشا یودوکیہ کو اماں کہہ کر پکارنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اور کوئی وجہ نہیں تھی کہ ایک لڑکا ایسے گھرانے سے قطع تعلق کر لے جس کا وہ ایک فرد بن چکا ہے۔

"آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟" جج نے یودوکیہ سے دریافت کیا۔

"میں نے بچہ نہیں چرایا ہے۔ مجھے یہ برساتی کی سیڑھیوں پر پڑا ملا، برف میں، میرے پاس اس کی رسید بھی موجود ہے۔"

اس نے رسید جج کی میز پر رکھ دی۔ لیکن جب جج نے رسید پڑھی تو نفرت سے پیشانی سکوڑ کر کہا — "یہ کیا بکواس ہے۔" پھر اس نے انّا سے کہا کہ عدالت کے سامنے اپنا بیان دے۔ انّا نے فتح مندی کی نظروں سے یودوکیہ کی طرف دیکھا اور اپنے تخیل کو بے لگام چھوڑ دیا۔ اس نے اپنے بیان میں "عزیز کامریڈ جج" کی بھرمار کر دی اور مطالبہ کیا کہ پرولتاری عدالت ایک محنت کش عورت کو مکانوں کے مالکوں اور معاشرے کی جونکوں سے بچائے

"ٹھیک ہے، کافی ہے۔" جج نے کہا اور شالتوں سے سوال کیا "آپ کو کچھ دریافت کرنا ہے؟" مرد کرسی پر پہلو بدلنے لگا اور کھچڑی بالوں والی عورت نے گہری، دردمند آواز میں پوچھا۔

"بچہ کہاں ہے؟" اور یہ کہہ کر اس نے یودوکیہ سے نظریں ملائیں گویا شاکی ہو کہ وہ ساشا کو کیوں ساتھ نہیں لائی

یودوکیہ کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی اور اس نے ادھیڑ عمر کی عورت کو محبت اور مسرت کی نظروں سے دیکھا۔

"بچہ یہیں ہے" وہ چلائی۔ "میں لاتی ہوں۔ برآمدے میں ہے۔"

وہ دروازے کی طرف دوڑی مگر اسے واپس بلا لیا گیا اور عدالت کا ایک اہل کار ساشا اور کاتیہ کو اندر لے کر آیا۔

ساشا اپنے نئے سیلر سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کی سیلر ہیٹ پر "آروزہ" جہاز کا نام تک لکھا تھا۔ جب جج نے اس کا نام پوچھا اور سوال کیا کہ وہ اپنے والدین کے یہاں بہت خوش ہے تو پہلے تو وہ بہت شرمایا۔ پھر اس نے جواب دیا کہ اس کا نام ساشا چیر نیشوف ہے اور وہ اپنے گھر میں بہت خوش ہے۔ جج نے اس سے کہا کہ اس کی ایک ماں اور بھی ہے تو اس نے جواب دیا۔ "بالکل غلط۔"

جج نے اس کی اصلی ماں کی طرف اشارہ کر کے سوال کیا کہ آیا وہ اس کے ساتھ جانا چاہتا ہے۔ اس موقع پر انّا نے سسکیاں لے لے کر آنکھیں ملنا شروع کر دیں۔ مگر ساشا دوڑ کر یودوکیہ کے دامن میں جا چھپا۔ اس چیز نے مقدمے کا فیصلہ کر دیا۔ ثالث کمرے سے باہر گئے اور کچھ دیر بعد جج نے واپس آ کر فیصلہ پڑھ کر سنا دیا کہ ساشا اپنے متبنّٰی خاندان کے ساتھ ہی رہے گا

ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے یودوکم اور یودوکیہ گھر لوٹے۔ ساشا ان دونوں کے درمیان چل رہا تھا۔ دونوں میاں بیوی اپنی اپنی جگہ سوچ رہے تھے کہ مقدمہ صرف میری وجہ سے کامیاب ہوا۔ یودوکم کا خیال تھا کہ اس کی گواہی نے جج کو قائل کر دیا اور یودوکیہ سمجھتی تھی کہ ساشا کو اپنے ساتھ لا کر اس نے ہی پالا مارا۔

خود ساشا کی رائے تھی کہ جج نے بالکل سفید جھوٹ بولا تھا۔ وہ بھدّے چہرے اور سُرخ ناک والی عورت اس کی ماں کس طرح ہو سکتی تھی؟ لیکن ایک

بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ کہ جج کو یہ جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ بہرحال بہت جلد اس کی توجہ دوسری طرف مبذول ہوگئی کہ اماں کو کس طرح بتلایا جائے کہ وہ اسے اور کاتیہ کو آئس کریم خرید کر دیں۔

۲۱

کئی سال گذر گئے۔

بچے بڑے ہو رہے تھے اسکول کی تعلیم اختتام پر تھی۔ اسکول چھوڑنے کے بعد پاویل لینن گراڈ جا کر اکیڈمی آف آرٹس میں داخل ہوگیا۔

نتالیہ، آمور دریا کے کنارے پر ایک شہر کی تعمیر میں حصہ لے رہی تھی اور صرف ایک دفعہ چھٹیوں ہی میں گھر آسکی تھی۔ دوسری مرتبہ آرام کی غرض سے اسے کریمیا کی ایک صحت گاہ میں جانا پڑ گیا۔ وہ کافی عرصے تک گھر سے غیر حاضر رہی۔ اور اس عرصے میں اس نے انجینئری کی ڈگری لی، شادی کی اور ایک بچے کی ماں بن گئی۔

آخر کار وہ ایک روز گھر واپس آئی اور جوان جہاں، بیاہی تیاہی، بچے کو گود میں لئے باورچی خانے میں آن کر بیٹھی۔ اس نے شہری لباس پہن رکھا تھا۔ انجینئر لڑکی! کیسے یقین آسکتا تھا کہ یہی نتالیہ اپنی ماں کی پرانی صدری پہنے ایک کمزور سی بچی کی حیثیت سے اس باورچی خانے میں داخل ہوئی تھی۔

"اب کہاں رہنے کا ارادہ ہے؟" یودوکیہ نے اس سے پوچھا "تمھارے دولہا تو مسوموسک میں رہیں گے اور تم یہاں؟"

"ہاں، مجھے یہاں کام پر بھیجا گیا ہے۔ وہ کتنے عرصے کو مسوموسک میں ہی

رہیں گے۔ اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہت سے شادی شدہ جوڑوں کا یہی حال ہے۔ کام کرنے والوں کی قلت ہے آج کل۔"

"اور تم کہاں کام کرو گی؟" یودوکم نے پوچھا۔

"تمھارے کارخانے میں ابا۔ ہیڈ ڈیزائنر کے دفتر میں"

"ہمارا پاویل تو اچھا خاصا آرٹسٹ بن گیا۔"

"پاویل بہت ذہین لڑکا ہے۔" نتالیہ نے جواب دیا۔ زندگی کے تجربوں نے نتالیہ کو ذرا درشت اور کم آمیز بنا دیا تھا۔ اگر ذرا سی نرمی اس کی آنکھوں میں جھلکتی تو وہ فوراً پلکیں جھکا لیتی تھی۔

"تم نے کہاں رہنے کو سوچا ہے" یودوکم نے محتاط لہجے میں دریافت کیا۔ اُسے خیال آیا کہ ممکن ہے نتالیہ کو یہ گھر اب معمولی سا لگے اور بہتر مکان میں رہنا پسند کرے۔

نتالیہ نے باورچی خانے پر ایک نظر ڈالی اور پوچھا "تمھیں جگہ کی تنگی ہے؟ بلا تکلف بتا دو۔"

"کونے والا کمرہ تمھارے لئے ٹھیک کیا جا سکتا ہے" یودوکیہ نے بے صبری سے جواب دیا۔ "مگر تم کو کاتیہ کے ساتھ شرکت کرنا پڑے گی۔ ساشا یہاں آتش دان پر سو سکتا ہے۔"

نتالیہ نے باورچی خانے اور کمروں کا جائزہ لیا۔

"ابھی تو ٹھیک ہے۔ مگر بعد میں ذرا دقت پڑے گی۔ ہم لوگ بہت سارے ہیں اور سب کو تھوڑی سی گنجائش اور تنہائی کی ضرورت ہوگی، ابا، سنو، چھت پر دوسری منزل کیوں نہ بنائی جائے؟"

"آج کل مکان بنانے کا سامان کہاں میسر ہے!"

"مل جائے گا۔ کوئی پرانا چوبی مکان خرید لو اس کو توڑ کر اس کا مسالہ اور لکڑی استعمال کر لیں گے۔"

"اور اس کے لئے پیسہ کہاں سے آئے گا؟"

"میں کماؤں گی اور باقی نکولائی فراہم کرے گا۔"

"اچھا" یودوکم نے کہا۔ وہ بہت خوش تھا کہ نتالیہ اپنے ماں باپ کے گھر میں رہ کر اسے بہتر بنانے کی خواہش مند تھی۔ ان کی بیٹی بڑی ہو چکی تھی اور برابری کی سطح پر شانہ بشانہ ایک بہتر زندگی کی جدوجہد میں ان کے ساتھ شامل تھی۔ ایک پرسکون فخر سے اس کا دل بھر آیا۔

دوسری منزل تعمیر ہو گئی مگر نتالیہ زیادہ دن وہاں نہیں رہی۔ جب اس کا شوہر انجینئر نکولائی لوکیانوف وہاں آیا تو اس نے اعلان کر دیا کہ وہ لکڑی کے مختصر مکانوں اور خیموں میں رہتے رہتے عاجز آچکا ہے اور ایک ایسے مہذب اور معقول فلیٹ میں رہنا چاہتا ہے جس میں غسلخانہ بھی ہو اور جہاں سے وہ ٹرین کے بجائے پیدل اپنے کام پر جا سکے۔ کارخانے کے قریب انجینئروں کے کوارٹرز میں سے ایک اسے بھی دیدیا گیا۔ اور نتالیہ مع اپنے بچے کے وہاں اٹھ گئی۔ کاتیہ اپنے گلاب اور جی رینیم کے پودوں سمیت دوسری منزل میں منتقل ہو گئی۔

۲۲

کاتیہ کو اچھے کھانے، اچھے کپڑوں اور رقص کا شوق تھا "سب سے مقدم چیز ہے ٹینگو ناچ پھر چاکلیٹ، باقی باتیں بعد کی ہیں۔" اس کا مقولہ تھا۔

اسکول کے سات سال ختم کرنے کے بعد وہ ٹیلی فون آپریٹرز کے اسکول میں داخل ہو گئی ۔ وہ جلد از جلد برسرِ روزگار ہو جانا چاہتی تھی ۔ ٹریننگ کے بعد وہ کمروڑی لینجا میں ٹیلی فون آپریٹر ہو گئی اسے گھر کے کام کاج سے نفرت تھی ۔ مگر یودوکیہ کی مدد کے لئے اس نے زیادہ سخت کام اپنے ذمے لئے ۔ پانی بھرنا، کپڑے دھونا، فرش صاف کرنا یہ سب وہ بڑبڑاتے اور گرجتے برستے ہوئے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ انجام دیا کرتی تھی ۔ اس کی اصل دلچسپی پھولوں سے تھی اور وہ خود بھی پھول سی شکل والی لڑکی تھی ۔

اسے حسین تو خیر نہیں کہا جا سکتا ۔ آنکھیں ذرا چھوٹی چھوٹی ۔ اور ناک اور ہونٹ، باریکی سے تراشے جانے کے بجائے گویا ذرا بھدے پن سے بنائے گئے تھے ۔ شانے چوڑے تھے اور جسم ذرا بھاری ۔ لیکن اس کے باوجود اس کی تیزی وطراری، شگفتگی، خوش لباسی اور بال سنوارنے کے ڈھنگ اور چھب نے اسے بہت دلکش بنا دیا تھا ۔ ناچتی خوب تھی اور بے حد مقبول تھی ۔

نوجوان لڑکے اسے تھیٹر لے جانے، گھر واپس پہنچانے اور اسے پیار کرنے کی کوشش میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں مصروف رہتے ۔ اپنی اس مقبولیت پر اسے بڑا گمان تھا مگر درحقیقت وہ ایک ایسے شدید خطرناک، شعلۂ جوالہ عشق کی آرزومند تھی جس کا ذکر ناولوں میں ہوتا ہے کہ اس کا عاشق مارے محبت کے دیوانہ ہو جائے گھٹنوں کے بل گر کر اس کی پرستش کرے، حسد کے مارے جل بھن کر خاک ہو جائے اور راتوں کی نیندیں اپنے اوپر حرام کرے ۔

کارخانے کی ایک ٹائپسٹ لڑکی ناستیہ فی فودوا سے کاتیہ کی دوستی

ہوگئی۔ یہ لڑکی بھی اسی طرح بالوں میں مصنوعی لہریں ڈالے، ویسے ہی چھب رکھتی تھی اور شدت سے چاہے جانے کی خواہش میں بھی کاتیہ کی شریک تھی۔ لنچ کے وقفے میں دونوں سہیلیاں، ہاتھ دھو، تھوڑا سا پاؤڈر چہرے پر لگا، ہاتھ میں ہاتھ دیے، آپس میں راز و نیاز کا تبادلہ کرتی کینٹین کی سمت بھاگتیں۔

آخر کار ایک روز کاتیہ کی رومانی آرزوئیں پوری ہوگئیں دمتری کولوسوف نامی ایک نوجوان کارخانے میں آکر ملازم ہوا۔ اپنی کم عمری کے باوجود وہ ایک ماہر فن کاری گر تھا۔ لیکن بے چین طبیعت کی وجہ سے کسی ایک جگہ ٹک کر کام نہیں کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی صحیح طور سے قدر نہیں کی جاتی۔ اس نے مختلف شہروں میں مختلف کام کیے تھے اور ہر جگہ کارخانے کے افسرانِ بالا سے جھگڑ چکا تھا۔

کلب میں اس کی کاتیہ سے ملاقات ہوئی۔ کئی مرتبہ اس کے ساتھ رقص بھی کیا اور اسے گھر پہنچانے گیا۔ ایک بار شب بخیر کہتے ہوئے کاتیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامے رکھ کر اس نے کہا: "میں بے حد دکھی ہوں۔ بہت تڑپ رہا ہوں۔ نہیں معلوم تمھیں —— نہیں معلوم؟" اس کی آواز لرزاں اور شدید قسم کے جذبۂ عشق سے بھرپور تھی۔ وہ کبھی بے تکے مذاق نہیں کرتا تھا نہ مہمل قسم کی تعریفیں کرنے کا عادی تھا۔ یہ ظاہر تھا کہ یہ ذہین نوجوان محبت کرنے کا اہل تھا۔

کاتیہ گویا پروں پر اڑ کر اپنے کمرے میں پہنچی۔ اصل عشق اسے کہتے ہیں! رات رات بھر جاگتا ہوگا بیچارہ۔ وہ اس کے اظہارِ عشق کے جواب میں ہنس پڑی تھی؛ اسی وجہ سے شاید وہ غریب کسی شرابی کی طرح لڑکھڑاتا ہوا واپس جا رہا ہوگا۔

رات بھر اس نے اس کے متعلق سوچا۔ کروٹیں بدلیں۔ اٹھ اٹھ کر کھڑکی میں گئی۔ ناولوں کی منظر کشی کے مطابق اس نے اپنی گرم گرم پیشانی کو سرد شیشے سے ٹکا دیا۔ کہ ہر ناول میں یہی نسخہ درج تھا۔

آغاز محبت کی کیا شاندار رات تھی۔!

اور نام بھی کتنا پیارا تھا۔ کیسا نغمہ ریز ——— دمتری کو لوسوف ——— رومیو اور اوتھیلو اس پر سے قربان۔ وہ اس کے سامنے جھکا ہوا، رشک و حسد کی آگ میں جلتے ہوئے رقیبوں کو مارنے کے لئے تیار۔ اور اتوار کو وہ اسے شہر سے دور ——— بہت دور افق کے اُس پار لے جائیگا۔ وہ کتنی مسرور تھی! اس کے عشق کے راز سے کوئی واقف نہ تھا۔ کم از کم اس کا یہی خیال تھا اور دِمتری اس قدر سیماب صفت اور چھا جانے والی شخصیت تھا کہ اُس کا مطالبہ تھا کہ کاتیہ نہ کسی اور پر نظر ڈالے اور نہ کسی سے بات کرے۔ دمتری کے اس احساس ملکیت نے اس کا سحر اور بھی دو بالا کر دیا۔

پیار و محبت کے اس نشیلے دور میں صرف ایک بار کاتیہ نے اس سے ایک سوال کیا (اور پھر اسے بڑی ندامت ہوئی کہ اس ارضی جنت میں جس میں زندہ تھی یہ کتنا بھونڈا اور بے تکا سوال تھا) "دِمتری ـــ ہم شادی کریں گے نا؟"

"یقیناً" اس نے جواب دیا "مگر جلدی کیا ہے؟ تھوڑا سا توقف بہتر ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔"

۲۳

یہ سال بہت ہی اچھا تھا۔ مسلسل کامیابیوں کا سال۔ یودوکم کی ورکشاپ

کو فیکٹری میں پہلا انعام ملا۔ کاریگروں کو بونس دیئے گئے۔ یودوکم کو سونے کی گھڑی ملی جس پر تعریفی جملے منقش تھے۔ پیلیس آف کلچر سرکاری تقریب میں یودوکیہ بھی اس کے ساتھ گئی۔ نئے اونی لباس میں ملبوس، کاتیہ کی خوش بوے معطر بروتر لگائے وہ شاداں و فرحاں متفخر اور متین، ہال میں جا کر بیٹھی یودوکم اسٹیج پر موجود تھا۔ اور وہ اپنے پیارے شوہر کو ناز بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

نتالیہ کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام ہلینا رکھا گیا۔ ایام حمل اور ولادت کو اس کے کام میں مخل نہ ہونے دیا گیا۔ وہ ایک اہم منصوبے کے کمیشن پر نامزد کر دی گئی۔ رات گئے تک اس کے پاس ضروری ٹیلی فون آتے رہتے۔

لیکن یودوکیہ کا سب سے لاڈلا بچہ تو ساشا ہی تھا۔ وہ بہت اچھا لڑکا تھا۔ شریر ضرور تھا مگر دنگے فساد اور گالی گلوچ سے دور رہتا تھا۔ اسے والی بال کا شوق تھا اور سمندری سفر کے متعلق کتابیں تو گھول کر پی چکا تھا۔

مئی کے آخر میں پاویل گھر آیا۔ پاویل پترووچ چیرنیشوف آرٹسٹ، اس کی بیوی کلوودیہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ کلوودیہ سنہرے بالوں اور سرخ ناخنوں والی ایک کم عمر نازک اندام لڑکی تھی۔ وہ ایسے فیشن ایبل کپڑے پہنتی تھی جو اس علاقے میں پہلے کسی نے نہیں دیکھے۔ جوتے بھی بہت اونچی ایڑی کے پہنتی تھی۔ شاید یہ بلندی بھی اس کے لئے کافی نہیں تھی۔ تب ہی تو وہ ہمیشہ پنجوں کے بل کھڑی رہتی جیسے پرواز کے لئے پر تول رہی ہو۔ کبھی نچلی نہ بیٹھتی چڑیا کی طرح پھدکتی رہتی۔

میز پر بہترین کپڑا بچھا کر جوش و خروش سے نئے جوڑے کا جام صحت پیا گیا۔ شرم سے لال گلابی پاویل اپنی بیوی کے چہرے سے نظریں نہ ہٹا سکا۔ وہ اس پر بری طرح فریفتہ تھا۔

"کلوودیہ نے تم سب کو بہت پسند کیا ہے ۔ تم کو بھی کاتیہ ۔"
اس نے کہا۔
"مجھے بھی اچھی لگی ہے تمھاری دلہن ۔ غضب کی خوبصورت ہے۔"
"اماں ۔ تم کو کیسی لگی ؟" پاویل نے دریافت کیا۔
"ٹھیک ہے۔ بہت اچھی ہے۔ لیکن اسے سب کے سامنے لپ اسٹک لگانے کی کیا ضرورت پیش آئی ؟"
"کیا حرج ہے ۔ بے شمار عورتیں لپ اسٹک لگاتی ہیں۔"
"لیکن دوسروں کے سامنے تو نہیں۔ اور سگریٹ کیوں پیتی ہے ۔ صحت کے لئے بھی مضر ہے اور معیوب بھی۔"
"بڑی خوبصورتی سے سگریٹ پیتی ہے ۔ بڑے خوابناک انداز میں۔" کاتیہ نے توصیفاً کہا ۔
"میں نے اس کی تصویر بنائی ہے ۔ جس میں اس کا چہرہ سگریٹ کے دھوئیں میں چھپا ہوا ہے۔" پاویل نے جواب دیا۔
"اس میں کیا خاک خوبصورتی ہے ؟ جوان جہاں عورت کارخانے کی چمنی کی طرح بیٹھی دھواں اُگل رہی ہے۔" یودوکیہ نے کہا۔ پاویل نے ہنس کر ماں کا سر چوم لیا۔
پاویل طویل عرصے کے لئے آیا تھا ۔ اسے میوزیم کے لئے ایک تصویر تیار کرنا تھی۔ دونوں میاں بیوی نے اوپر کا کمرہ لے لیا اور کاتیہ چھوٹے کمرے میں منتقل ہو گئی۔ صبح سویرے پاویل نیلے رنگ کی ٹوپی پہنے ایزل سنبھالے دریا کے کنارے چلا جاتا ۔ یودوکیہ اس کے لئے دوپہر کا کھانا لے کر جاتی ۔ اسے دراصل پاویل پر ترس آتا تھا ۔ وہ دوسرے مردوں سے اس قدر مختلف تھا بے چارہ

عورتوں کی طرح کی ٹوپی پہنے ندی کنارے بیٹھا تصویریں بنایا کرتا جب کہ دوسرے مرد کارخانوں اور دفتروں میں کام کر رہے تھے۔

کام ختم کر کے وہ کلو ودیہ سے ملنے چلا جاتا جس نے شہر کے ایک تجارتی دفتر میں ملازمت کر لی تھی۔ شام کو وہ دونوں گھومنے نکل جاتے یا ملاقاتی ان سے ملنے کے لئے آجاتے۔ کلو ودیہ اپنے مہمانوں کو اوپر کی منزل میں چائے پلاتی لیکن یودوکیہ سے ملانے کے لئے ان کو کبھی نیچے نہ لائی۔ یودوکیہ کو اس بات کا بڑا صدمہ ہوا۔ اس لڑکی نے اپنے میاں کو چڑی کا غلام بنالیا تھا۔ انگلیوں پر نچاتی تھی۔

۲۴

کاتیہ شام کی شفٹ میں کام کر رہی تھی۔ آج پارٹی کی میٹنگوں کا دن تھا۔ پارٹی کے اراکین اپنے اپنے اجلاسوں میں چلے گئے تھے۔ اس لئے بہت کم ٹیلی فون آرہے تھے۔ کاتیہ سوئچ بورڈ پر بیٹھی دمتری سے اپنی پچھلی ملاقات یاد کر رہی تھی۔ دمتری نے اس سے کیا کہا تھا اور اس کے چہرے پر کس طرح کے جذبات تھے ـــــ اتنے میں کھڑکی میں سے اندر جھانک کر ناستیہ نے اسے آواز دی ـــــ "کاتیہ ـــــ کاتیہ ـــــ"

کاتیہ کو ایک دم محسوس ہوا کہ کوئی خوفناک بات ہوگئی ہے۔ "کیا ہوا؟" اس نے زرد پڑ کر پوچھا۔ ناستیہ نے چاروں طرف دیکھا اور گیلری میں قدموں کی چاپ سنائی دی ـــــ "دمتری کو لوسوف کی بیوی آئی ہے۔"

اتنے میں ڈسپیچر آفس سے ایک کال آئی اور کاتیہ نے بھنبھیلے ہونٹوں

سے اسے وصول کیا۔ ٹیلی فون کرنے والا چیف انجینیر سے بات کرنا چاہتا تھا۔ کاتیہ نے جواب نہیں دیا اور نہ ہی کنکشن ملایا۔ ساکت و صامت، منجمد بیٹھی سوئچ بورڈ کو تکتی رہی۔

"اس کو سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔" ناستیہ نے آہستہ سے کہا" وہ سیدھی یہاں آ رہی ہے۔"

یہ بات ہے! کاتیہ نے اپنے آپ کو مقابلے کے لئے تیار پایا۔ اپنے کندھے چوڑے کر کے اس نے مضبوط ہاتھوں سے کال کتب خانے سے ملا دی۔ وہ جم کر جنگ کرے گی اور اپنی محبت برباد ہونے سے بچائے گی۔ کیا ہوا اگر دمتری نے اس کو اب تک اندھیرے میں رکھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس پر مرتا تھا۔ یہ ان دونوں کا اپنا ذاتی معاملہ تھا۔ دمتری چاہے اچھا ہو یا بُرا وہ اس کا ساتھ نہیں چھوڑے گی۔ دنیا جائے جہنم میں۔

گیلری میں قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ کوئی بھاری بھاری قدم رکھتا، ٹھٹھک ٹھٹھک کر غالباً دروازوں کی تختیوں پر لکھے ہوئے نام پڑھتا ہوا ادھر آ رہا تھا۔ کاتیہ غنیم کے حملے کا مقابلہ کرنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

سُرنگ جیسی گیلری بڑے بڑے بغیر شیڈ کے قمقموں سے روشن تھی۔ اس سُرنگ میں سے ایک عورت نمودار ہوئی۔ وہ بہت لمبی تھی۔ چہرہ بہت چھوٹا سا اور معمولی اور بھنویں بالکل غائب۔ دمتری کی بیوی!! اس نے بھورے بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا باندھ رکھا تھا اور پرانی زرد رنگ کی شال پھسل کر اس کے کندھوں پر آ گری تھی۔ کم رو، بد ہیئت اور طرہ یہ کہ حاملہ ۔۔۔ بے چاری بے چاری عورت۔ کاتیہ کو لگا جیسے تیز روشن گیلری زور

زور سے چکر کاٹ رہی ہے - جھولا جھول رہی ہے -

عورت نے کاتیہ سے آگے جا کر دروازے کی تختی پر نظر ڈالی - اور رک گئی - اس کے بائیں ہاتھ میں سورج مکھی کے بیج تھے جن کو وہ بڑی حماقت سے دائیں ہاتھ میں لے کر پھانک رہی تھی - بیج کا گیلا خول اس کی ٹھوڑی پر چپک گیا تھا -

عورت نے بے زبان، گونگے صدمے اور مایوسی کی نظروں سے کاتیہ کو دیکھا، ان نظروں میں نفرت نہیں تھی - اس نے جبلّی طور پر کاتیہ کو پہچان لیا - کاتیہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے - لیکن اسے یہ معلوم تھا کہ وہ جو کچھ بھی کہے گی وہ جھوٹ ہوگا - ایک بچہ دنیا میں آنے والا تھا - اور اس بچّے کا کوئی باپ نہیں ہوگا - رہی یہ بدشکل اور عامیانہ سی عورت —— کیا وہ اس قسم کی عورت کے خلاف نبرد آزما ہو؟

"کیا چاہتی ہیں آپ؟" اس نے نووارد سے سوال کیا -

"تلاش کر رہی ہوں!"

"کسے؟ کیا کام ہے؟"

"کچھ نہیں، صرف یہی تلاش کرنے آئی ہوں کہ وہ کس قسم کی عورت ہے جو میاں بیوی کے درمیان آسکتی ہے!"

"میاں بیوی کے درمیان؟ آپ میرے متعلق کہہ رہی ہیں؟ مجھے آپ سے کیا مطلب؟"

"تم نے میرے شوہر کو چھیننے کی کوشش کی ہے تم کون ہوتی ہو؟ میں پانچ سال سے اس کی قانونی بیوی ہوں - اور تم —— تمہارا شادی شدہ نام کیا ہے؟ میرا نام کولیسووا ہے اور تم —— تم اس کی کیا لگتی ہو؟"

"تو رہو قانونی بیوی۔ مجھے تمھارے شوہر کی قطعی حاجت نہیں ہے تم کو مبارک ہو۔ مجھے نہ وہ پہلے چاہیے تھا اور نہ آئندہ چاہیے۔ اس طرح کی بازاری افواہ اور بکواس سن کر یہاں آ پہنچنے سے تمھارا مطلب کیا ہے آخر؟" کاتیہ نے بڑے جوش سے پوچھا۔

اس بات پر عورت آگ بگولا ہو گئی۔

"بازاری افواہ ____؟ یہ اصلیت ہے تم اس سے مکر نہیں سکتیں۔ مجھے بہت سے معتبر لوگوں نے بتایا ہے کہ تم باہوں میں باہیں ڈال کر اس کے ساتھ گھوما کرتی ہو۔"

"تو کیا ہوا!؟ بہت سے مرد باہوں میں باہیں ڈال کر میرے ساتھ گھومنا چاہتے ہیں۔"

جھوٹ بولنے کی وجہ سے کاتیہ کا گلا رندھ گیا۔ مگر اسے یہ تلخ قصہ ختم کرنا تھا "تم اس طرح کی بے تکی، بے سر و پا افواہوں میں یقین کرتی ہو، تم کو شرم آنی چاہیے۔ اور یہاں تک آن پہنچیں! ہونہہ میری شادی ہونے والی ہے اور تم خواہ مخواہ میرے نام پر کالک لگانے یہاں آ دھمکیں۔ تمھارا خیال ہے۔ میں جھوٹ بول رہی ہوں؟ اچھا کان کھول کر سن لو۔ آج کے دن سے تمھارا چھیل چھبیلا دمتری الیوانووچ میرے آس پاس دور دور تک نہیں پھٹکنے پائے گا۔ تمھارے دوست تم کو ضرور خبریں پہنچاتے رہیں گے۔ تم دیکھ لینا میں اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا تو درکنار اسے ہلو بھی نہیں کہوں گی ایسے تم ہی تعویذ بنا کر رکھو۔"

اتنا کہہ کر وہ سویٹ بورڈ کے کمرے میں چلی گئی۔

"جھوٹی لپاڑن کہیں کی۔" کولیسو وا نے بند دروازے کے باہر

کھڑے کھڑے کہا۔
"اے لو۔ تم ابھی گئی نہیں ؟" کاتیہ نے کھڑکی میں سے جھانک کر کہا "چلی جاؤ بی بی۔ قصہ پاک ہو گیا۔"
"تم مجھے جل دے رہی ہو" کولیسودا نے غیر یقینی انداز میں کہا۔
"میں مصروف ہوں۔ مجھے کام کرنا ہے۔ اب جاؤ۔ سدھارو۔ رخصت ہو۔ اپنے میاں کی قانونی بیوی، میاں کے پاس واپس جاؤ اور بغیر کسی فکر اور سوچ کے اپنے بچے کو جنم دو۔"
"ناراض مت ہو" کولیسودا نے کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
"میں ناراض نہیں ہوں اور اب ٹسوے مت بہاؤ۔ تم تو ایک مکھی کو بھی دکھ نہیں پہنچا سکتیں، ناراض نہیں کر سکتیں۔ تم اس طرح کی عورت ہو۔ اور اگلی دفعہ جب تمھارے میاں کوئی ایسی ویسی حرکت کریں تو تم اپنی خوشیوں اور حق کے لئے بہادری سے لڑو ـــ آج کی طرح نہیں۔ کہ لگیں رونے ـــ"
"پھر میں کیا کروں ؟ کس طرح قابو میں رکھوں اسے ـــ ؟" کولیسودا نے بھولے پن سے دریافت کیا۔
"مجھے معلوم نہیں۔" کاتیہ نے جواب دیا۔ "مجھے کبھی ایسی بات کی ضرورت نہیں پڑی۔ مگر آئندہ کبھی یہ طریقہ اختیار نہ کرنا۔"
دفعتاً اس نے دیکھا کہ ڈسپیچر کے دفتر کا کنکشن ابھی تک لائبریری سے ملا ہوا ہے۔ اس نے کنکشن الگ کیا۔ غالباً اسے کل سخت سزا ملے گی شاید نوکری ہی سے اسے برخاست کر دیا جائے۔ مگر اب کیا پرواہ ہے کچھ نہیں۔
کولیسودا چلی گئی۔ کاتیہ کا سر سوئچ بورڈ پر گر گیا۔ اسے لگا کہ وہ

اپنے گرد و پیش سے بے نیاز ، مر چکی ہے ۔

"کاتیہ" ناستیہ نے کہا " تم نے یہ تو سچ نہیں کہا کہ تم دِمتری کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دو گی ۔"

" اس کی بیوی کے یہاں بچہ ہونے والا ہے ۔" کاتیہ نے جواب دیا ۔ " تم نے دیکھا نہیں ۔"

" مگر پھر بھی تم نے یہ کیا کیا ۔"

" یہاں سے چلی جاؤ . . . ." کاتیہ نے مدھم آواز میں جواب دیا ۔ اور اپنا تنتا ہوا زرد چہرہ دوسری طرف پھیر لیا ۔ " مجھے اکیلا چھوڑ دو ۔ اوہ — ہم عورتیں کتنی احمق ہیں ۔"

لیکن اس نے کولیسووا سے جو وعدہ کیا تھا اسے پوری طرح نہ نبھا سکی ۔ ہفتے بھر کے اندر اندر دمتری اس سے ملنے کے لئے سوچ بورڈ روم میں آن دھمکا ۔ کاتیہ نے اسے دھتکارا نہیں ۔ اس سے بات بھی کی ۔ مگر اس دفعہ بات صرف الوداع کہنے کے لئے تھی ۔

دِمتری کی بیوی کے ساتھ اس کا معرکہ شروع جون ۱۹۴۱ء میں پیش آیا تھا ۔ ۲۲ ؍ جون کو جنگ چھڑ گئی ۔ دمتری کا فوج سے بلاوا آ گیا ۔ وہ اپنے بدترین کپڑوں میں ملبوس کاتیہ کے دفتر آیا ۔ فوج میں جانے والے عموماً اپنے بدترین کپڑے پہن لیتے تھے ۔ گیس ماسک اس کے کندھے سے لٹکا ہوا تھا ۔ گویا پہلی مرتبہ ان باتوں کی طرف دھیان دے رہا ہو جو پہلے اس کے خیال میں کبھی نہ آئی تھیں ۔

۲۵

فوجی بھرتی کے کاغذات پاویل کے پاس بھی پہنچ گئے۔
"اچھا اماں — میں تو چلا لام پر —— اس نے یودوکیہ کے سامنے بشاش نظر آنے کی سعی کرتے ہوئے کہا۔
کلوودیہ جب کام سے گھر واپس آئی تو پاویل کے جانے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ وہ اپنی تصویریں سمیٹ رہا تھا۔ یودوکیہ آٹا گوندھ رہی تھی اور کاتیہ پاویل کی بنیائنیں دھونے میں مصروف تھی۔ کلوودیہ ہکا بکا رہ گئی — اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور اس نے غصے سے سوال کیا "لیکن تم تو آرٹسٹ ہو۔ تم کو جبری بھرتی سے مستثنیٰ کرنا چاہیے۔ ایک باکمال مصوّر بندوق اٹھائے۔ کیا حماقت ہے۔"
"ذرا سوچو تم کیا کہہ رہی ہو کلوودیہ" پاویل نے آہستہ سے کہا۔
کلوودیہ اس کے کندھے سے لگ کر رونے لگی "مجھے معاف کر دو پاویل۔ مگر تم میری زندگی ہو۔ کیا اب ہماری مسرتوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔"
"معلوم نہیں۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ جب تک زندہ ہوں تمھیں اسی طرح چاہتا رہوں گا۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔"
"یہ خاتمہ نہیں ہے" چلیمچی پر جھکی ہوئی کاتیہ نے کہا اور سیدھی کھڑی ہو کر بالوں کی ایک مصنوعی لہر جو اس کی پیشانی پر آ گری تھی پیچھے ہٹائی۔ "یہ خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ آنسو ٹسوے مت بہاؤ۔" چلیمچی اٹھا کر وہ طنزیہ آواز میں بولی "بھاگ جاؤ یہاں سے کلوودیہ ورنہ میں یہ سارا پانی تمھارے منہ

پر پھینک دوں گی۔ راستہ چھوڑ دو۔" اس نے میلا پانی ایک بالٹی میں انڈیل دیا۔

پاویل اور کلوودیہ کے اوپر چلے جانے کے بعد یودوکیہ نے اس سے کہا۔ "اپنے بھائی سے جو لڑائی پر جا رہا ہے ایسی بدتمیزی؟"

"لڑائی پر جا رہا ہے تو کیا ہوا۔ یہ رونا پیٹنا کیوں؟" کاتیہ نے جواب دیا۔ "میں بھی فوج میں بھرتی ہو گئی ہوں۔ اب مجھ سے کچھ نہ کہنا اماں۔ میں نے خود اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ اور میں زندہ واپس آؤں گی دیکھ لینا ضرور واپس آؤں گی۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا ــــــ واپس آؤ گی۔" یودوکیہ نے غصے سے کہا۔ "تم کو تو یہ بھی پتہ نہیں کہ بندوق کی نالی کدھر ہوتی ہے اور دستہ کدھر۔"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے بندوق اٹھانا آتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اسے رائفل کہتے ہیں، بندوق نہیں۔"

"اور تیسرے یہ ــ" چودہ سالہ ساشا نے جو بڑے انہماک سے یہ مکالمہ سن رہا تھا، ارشاد کیا۔ "کہ کاتیہ کو 'سگنلز' میں بھرتی ہونا چاہیے۔ وہاں سوئچ بورڈ چلا سکتی ہے۔"

"اسے جو کرنا چاہیے یا نہیں کرنا چاہیے تم کو اس سے مطلب؟ لڑکیاں کب سے لام پر جانے لگیں؟ حد ہے۔"

کاتیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ چلمچی میں پانی کی چھپ چھپ کی آواز آتی رہی۔

"تمہارے باپ کو معلوم ہے؟"

یودوکم کو معلوم تھا، اسے کارخانے میں پتہ چل گیا تھا کہ کاتیہ نے بھرتی کے کاغذات حاصل کرنے کی درخواست دے دی ہے۔ وہ صرف سر ہلا کر چپ رہا تھا کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن دوسروں نے اس سے کہا۔ "لیکن۔

ٹینگو ناچ اور نفیس جوتے وہاں کہاں سے آئیں گے ؟"

"یہ تفریحیں امن کے زمانے کے لئے ہیں"۔ کاتیہ نے خود ہی ان کا منہ بند کر دیا۔ "جب لڑائی ختم ہو جائے گی تو میں پھر اچھے اچھے جوتے پہن کر ناچا کروں گی"۔

پاویل کی روانگی بہت الم خیز تھی۔ حالانکہ سب گھر والوں نے بڑے صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا۔ کندھے پر تھیلا لٹکائے پرانا سوٹ پہنے، پاویل عام لوگوں سے مختلف، یا کمال مصتوں کے بجائے ایک معمولی رنگروٹ معلوم ہو رہا تھا۔ کلوودیہ ایک فلیشن ایبل ٹوپی پہنے اس کے پاس کھڑی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ بھرتی کے دفتر میں صرف وہی پاویل کو الوداع کہنے جائے۔ نتالیہ بھی اپنے شوہر کے ساتھ آئی۔ پرانی رسم کے مطابق جانے سے پہلے سب بیٹھ گئے۔ پاویل نے سب کو پیار کیا اور یودوکیہ سے کہا۔ "اماں — اماں — میں" پھر وہ کچھ نہ کہہ سکا اور جھک کر یودوکیہ کے مضبوط، مہربان ہاتھ چومنے لگا۔ پھر بے ڈھنگے پن سے اٹھ کر چوکھٹ سے ٹکراتا ہوا باہر چلا گیا۔

کاتیہ رو پڑی اور اس کے پیچھے پیچھے دوڑی۔ سارا کنبہ پھاٹک پر کھڑا اسے گھر سے دور جاتا دیکھ رہا تھا۔ کلوودیہ اس کا ہاتھ تھامے اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ مگر نجانے کیوں، کوئی غیر مرئی چیز اس کو کلوودیہ سے ممیّز کر رہی تھی۔ جس طرح وہ اپنے سارے گھرانے سے علیحدہ اور مختلف نظر آ رہا تھا۔

اس کے جانے کے بعد نتالیہ کے شوہر کی باری آئی۔ اس کے بعد کاتیہ بھی چلی گئی۔ گھر سونا ہو گیا۔

۲۶

یودوکیہ کا جغرافیہ کا علم بے حد ناقص تھا۔ اسے سان و گمان بھی نہ تھا کہ

سوویت یونین میں اتنے بہت سارے شہر آباد ہیں۔ اسے صرف یورال کے پہاڑوں کا پتہ تھا جہاں اس کا اپنا وطن تھا۔ اور کچھ اور ایسے مقامات کا بھی علم تھا جیسے چیلیا بنسک، پیرم، سوئیردلوودِسک۔ ایک قصبہ کورِیہ بھی تھا۔ جہاں سے وہ اپنی گائے کے لئے چارا خریدنے جاتی تھی۔ ان کے علاوہ نوووستی بیرسک، کیرووا اور گورکی اور بہت دور پر ماسکو اور لینن گراڈ تھے۔ اب اچانک اسے ان ڈھیروں نئے شہروں کا علم ہوا جن پر جرمن قابض ہوتے جا رہے تھے۔ یہ کیسے ہو رہا تھا؟ جرمنوں کے اس ٹڈی دل کو کس طرح روکا جائے؟

اسے شکوے شکایت کی عادت نہ تھی۔ ظاہری طور پر پُرسکون رہتی مگر اندر ہی اندر دل میں پنکھے لگ گئے تھے۔ بچوں کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ پادیل اور کاتیہ جانے کہاں اور کس جوکھم میں تھے۔ ساشا بڑا ہو رہا تھا اور فوج میں جانے کے لئے بے قرار تھا۔ اس کا پیارا، لاڈلا ساشا۔ کھانے پکاتے پکاتے وہ حضرت داؤدؑ کی ایک مناجات کے الفاظ دہرانے لگی۔

"تم رات کے قہر سے خوفزدہ نہیں ہوگے۔
نہ اس تیر سے جو دن میں سنسناتا ہے۔
نہ طاعون اور وبا سے جو رات کو چلتی ہے
نہ اس تخریب سے جو دوپہر کو تباہ کرتی ہے۔
تم شیر ببر اور سانپ کے اوپر پاؤں رکھوگے۔
تم جوان شیر اور سانپ کو قدموں تلے روندوگے"

لیکن سانپ تو سر سراتے ہوئے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ انھوں نے یوکرین کو تباہ کرنے کے بعد لینن گراڈ کا محاصرہ کر لیا تھا اور ماسکو کی طرف

رواں تھے۔

لینن گراڈ، ماسکو اور کیو سے مہاجروں کا سیلاب امنڈ آیا۔ ان کو شہر کے سارے مکانوں میں جگہ دی گئی۔ یودوکیہ کے گھر میں دوسری منزل کا کمرہ ماسکو کے ایک پروفیسر، اس کی بیوی اور دو سالیوں کو دے دیا گیا۔۔۔ یودوکیہ کو پروفیسر پر بڑا ترس آتا، وہ ایک کھچڑی بالوں والا محتاط سا آدمی تھا۔ نمدے کے جوتے پہنے بڑی دقت سے سیڑھیاں اترتا کیونکہ اسے نمدے کے جوتوں کی عادت نہیں تھی۔ منہ دھونے کی چلمچی استعمال کرتے وقت کوشاں رہتا کہ پانی گرنے کی آواز نہ آئے اور فرش نہ بھیگے۔ لیکن جہاں تک اس کی بیوی اور سالیوں کا تعلق تھا، پہلے ہی دن سے یودوکیہ نے گھر صاف رہنے کے سلسلے سے ان کے خلاف خاموش اعلان جنگ کر دیا۔ ان عورتوں نے اپنے لینن گراڈ کے فلیٹوں فرنیچر کی شیخی ہانکی۔ لینن گراڈ میں تو وہ روز تھیٹر اور عجائب خانوں میں جایا کرتی تھیں پھر وہ بات بات پر اس سڑے بسے قصبے کا مقابلہ اپنی سابقہ زندگی سے کرتیں۔ تینوں گھر چلانے کے فن میں کوری تھیں۔ اور روسی اسٹوو پہ کھانا پکانا ان کے فرشتوں کو بھی نہیں آتا تھا۔ بادل ناخواستہ یودوکیہ کھانا پکانے میں ان کا ہاتھ بٹاتی اور ان کے پھیلائے ہوئے کوڑے کرکٹ کو صاف کرتی رہتی۔ اس کے باوجود اسے ان کی شکایتیں سننا پڑتیں۔ ۔کہ وہ جاہل ہے، اور اس کا گھر کتنا دقیانوسی اور معمولی ہے۔ ان پھوہڑ عورتوں کو جواب دینا یودوکیہ نے اپنی شان کے خلاف سمجھا اور یوں بھی وہ تینوں اتنی بکواسی تھیں کہ ان کے ساتھ ترکی بہ ترکی ٹرٹر کرنا یودوکیہ کے بس کا روگ نہ تھا۔ لیکن یودوکیہ پروفیسر کی بہت عزت کرتی تھی اور اس کے آرام و آسائش کا خیال رکھتی۔

لیکن ایک بات اچھی ہوئی کہ ان مہاجر عورتوں سے جنگ میں مصروف رہنے کی وجہ سے یودوکیہ کا دھیان بٹا رہا اور وہ اس کٹھن زمانے کو جھیل گئی۔

شسٹرکن نے پھر شراب خوری شروع کر دی۔ ایک دن وہ نشے میں دُھت یودوکیہ کے یہاں آکر خوب خوب گرجا برسا، رویا اور اسے مطلع کیا کہ بہت جلد جرمن یودوکیہ کے گھر بم برسانے والے ہیں۔ جرمنوں کے ذریعے آنے والی تباہی کا مظاہرہ کرنے کے سلسلے میں اس نے دو گلدان توڑ پھینکے۔ یودوکیہ کو گلدانوں کے ٹوٹنے پر بہت غصہ آیا اور اس نے شیسٹرکن کو بھگا دیا۔

"تم احمق ہو زمانے بھر کی ــــ" وہ دہاڑا "میں شرابی ہوں؟ نہیں ہیں تو اپنے غم اور اپنی اہانت کو بھلانے کے لئے پیتا ہوں ــــ احمق ـ"

اس سال جاڑے جلدی آ گئے۔ بڑی شدید سردی پڑنے لگی۔ اندھیرے جنگلوں اور اداس شہر اور کارخانے کی دن رات دھواں اگلتی چمنیوں کے اوپر برفانی طوفان گرجنے لگے۔ برف کے بگولے آسمان اور بادلوں کی سمت اٹھتے اور انسانی ہمت کو وحشی جنگلوں اور تباہیوں کے سرد شکنجے میں جکڑے رہتے۔

شیسٹرکن کے جانے کے بعد یودوکیہ صندوق پر بیٹھ کر آنسوؤں کے بغیر کراہتی اور ہاتھ ملتی رہی۔ اس وقت وہ اپنے بچوں کو یاد نہیں کر رہی تھی۔ شسٹرکن کی مانند وہ رنج والم کے ایسے عظیم اور خوفناک بھنور میں ڈوب چکی تھی ذہن جس کا احاطہ کرنے سے قاصر تھا۔

"لعنت ہو کمبخت جرمنوں پر" وہ بڑبڑائی

یودوکم نے گھر آکر اپنی بیوی کو اس حالت میں پایا۔ اپنے گلے سے لگا کر اس نے یودوکیہ کے شانوں پر نرمی سے ہاتھ پھیرا۔

"گھبراؤ نہیں یوروکیہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم سب کچھ جھیل سکتے ہیں۔"

فورمین کی حیثیت سے وہ کارخانے میں بے حد مصروف رہتا تھا۔ شہر کے سوویت کے ڈپٹی کی حیثیت میں مہاجروں کی صحت کی دیکھ بھال اور ان کی شکایات کی شنوائی اس کے ذمے تھی۔ شدید مصروفیت کی وجہ سے اسے تکان کا احساس بھی نہ ہوتا۔ اکثر ایسے لمحے آتے جب زندگی کے متعلق اس کا سنجیدہ اور منطقی رویہ اس کا ساتھ چھوڑ دیتا۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھنجھلا اٹھتا لیکن پھر اپنے آپ سے کہتا "ابھی تو شروعات ہی ہے۔ اپنے اعصاب کو قابو میں رکھو میاں۔" لیکن اس کے باوجود پھر بار بار تلملا اٹھتا اور دوسروں پر چلانے لگتا۔ مہاجر اس کو سب سے زیادہ پریشان کرتے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کی شکایتیں کرتے۔ اسے غصہ آجاتا لیکن فوراً یہ سوچ کر نادم ہوتا کہ یہ لوگ اپنے گھر بار چھوڑ کر یہاں آئے ہیں۔ ابھی ابھی وہ جس شخص پر چلایا تھا، اس کی بیوی، بچے اور ماں ہزاروں میل دور محصور شہر میں موجود تھے۔ ممکن ہے وہ سردی اور بھوک سے مر چکے ہوں یا بمباری نے ان کو ہلاک کر دیا ہو۔ اور وہ خود آرام سے کرسی پر بیٹھا کام میں مصروف تھا۔ پھر وہ انتہائی دل گرفتہ اور مایوس آواز میں کہتا — "اچھا — اچھا۔ برا نہ مانو میں ڈائریکٹر سے کہتا ہوں کہ تمہارے رہنے کے لئے کسی اور جگہ کا انتظام کیا جائے۔"

کارخانے میں اکثر اس کی ملاقات نتالیہ سے بھی ہو جاتی اور وہ اس سے نکولائی کی خیریت دریافت کرتا۔ ایک دن اس نے دیکھا کہ نتالیہ پیلی اور کمزور نظر آرہی ہے اور اس کے بال کنپٹیوں پر سفید ہو چلے ہیں۔

"کیا بات ہے، کیا ہوا؟" اس نے دریافت کیا۔

وہ تیوری پر بل ڈال کر بولی: "وہ جو سب کے ساتھ ہو رہا ہے"۔
"تمھارا میاں کیا لکھتا ہے؟"
"کوئی خاص خبر نہیں ـــــ زندہ ہے"۔
"بچوں کو لے کر گھر پر آجاؤ۔ ہم سب اکٹھے رہیں گے"۔
"اماں پر کام کا ایک اور بوجھ پڑ جائے گا"۔
"بکواس۔ بچوں کو لے کر آجاؤ"۔ یودوکم نے کہا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

دن رات کارخانے کی چمنیاں دھواں اگلتی رہیں۔ ٹینکوں اور توپوں سے لدی ہوئی ٹرینیں برف کے طوفان میں سے گزرتی مغرب کی سمت رواں رہیں۔

ایک شام گھر لوٹ کر یودوکم نے اپنی بیوی کو اطلاع دی۔
"یودوکیہ ـــــ جرمنوں کو ماسکو سے مار کر بھگا دیا گیا"۔

۲۷

دن برسوں میں تبدیل ہو گئے۔

دشمن کو مار بھگایا جا چکا تھا۔ اس کے لشکر متواتر مغرب کی سمت پسپا ہو رہے تھے۔ پاویل اور کاتیہ نانتسی جرمنی کی سرحدوں پر لڑنے میں مصروف تھے۔ تقریباً ہر شام ریڈیو تازہ ترین فتوحات کی خبریں سناتا۔ لوگ زیادہ مہربان اور بشاش ہوتے جا رہے تھے۔

ساشا کے لئے بھی روزِ مسرت آپہنچا تھا۔ اس نے محاذ جنگ پر جانے کی اجازت مانگی۔ مگر اسے میدانِ جنگ فوراً نہیں بھیجا گیا۔ نہ اسے اس کی آواز

کے مطابق کسی جنگی جہاز پر تعینات کیا گیا۔ لیودوکیہ نے شکر ادا کیا کہ اسے ایک فوجی اسکول میں لے لیا گیا جو میدانِ جنگ سے بہت دور عقب میں تھا۔

نتالیہ کو نقشے اور نمونے بنانے والے دفتر کے افسر اعلیٰ کی معاون بنادیا گیا۔ اس نے اپنے بچوں ڈُلودیہ اور لینا کو کیروف اسٹریٹ پر جاکر گھر پہ لیودوکیہ کی نگرانی میں چھوڑ دیا تھا۔ وہ خود رات کو دفتر ہی میں سوتی تھی اور وہیں کھانا کھاتی تھی۔ لگتا تھا کہ جیسے اس کا قد پہلے سے زیادہ لمبا ہو گیا ہے۔ اس کی آواز اور چال ڈھال میں ایک شان اور گمبھیرتا اور آگئی تھی۔ اس کی آرزوئیں پوری ہو گئی تھیں۔ اور اس کی زندگی اب صرف کارخانے کے لئے وقف تھی۔ بچے اب اس کے لئے ایک قسم کا جنجال سا تھے۔ اسے بچے پیدا کرنا نہیں چاہیے تھے وہ سوچتی لیکن جب انھیں خسرہ نکل آئی تو پریشانی کے مارے اس سے کارخانے میں کام کرنا محال ہو گیا۔ اور شام کو گھر جانے کا بے صبری سے انتظار کرتی۔ تاکہ ماں کی دل سوزی کے ساتھ ان کی تیمارداری کر سکے۔ اسے خود کھانے پینے کا چنداں شوق نہ تھا مگر فیکٹری کی دوکان سے چیری کا مربہ خرید کر اسے بے حد مسرت ہوئی۔ اور یہ سوچ کر مسکراتی ہوئی مربے کا مرتبان گھر لے گئی کہ کسی طرح لینا خوشی سے چلائے گی اور ڈُلودیہ نانی سے چمچہ مانگے گی۔

دن گزرتے گئے۔ ایک روز اخبار میں پاویل کا نام ان فوجیوں کی فہرست میں شائع ہوا جن کو بہادری کے صلے میں تمغے دیئے گئے تھے۔ لیودوکم اور لیودوکیہ اسے مبارکباد بھیجنے ہی والے تھے کہ اس کا خط آگیا۔ اس نے لکھا تھا کہ ایک معمولی سے زخم کی وجہ سے وہ ہسپتال میں ہے۔ کچھ خون بہہ گیا ہے مگر نیا خون اس کے جسم میں داخل کیا جا چکا ہے اور اب وہ روبہ صحت ہے۔

اگر اس کے خط پر یقین کر لیا جاتا تو خبر ایسی تشویشناک نہ تھی۔ اس نے

لکھا تھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ اور یہ کہ "آپ لوگ مجھے برابر خط لکھتے رہیے کلو ودیہ کے خط بہت کم آتے ہیں۔" ان الفاظ پر کلو ودیہ نے اپنی نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں اور یودوکیہ نے آہستہ سے ایک آہ بھری۔

ایک سیاہ مونچھوں اور سیاہ کوٹ والا شخص دو مرتبہ گھر پر آچکا تھا۔ یودوکیہ کو گیلری میں دیکھ کر اس نے بڑے اخلاق سے ٹوپی اُتاری تھی لیکن یودوکیہ قسم کھا سکتی تھی کہ عورتوں کی طرح اس نے اپنی بھنویں تراش رکھی تھیں۔ یودوکیہ کو بہت گھن آئی تھی۔

"کسی کام سے آیا تھا یہ —— آدمی؟" اس نے بہو سے پوچھا۔

"ہاں" کلو ودیہ نے جواب دیا تھا اور اس کے بعد ساس بہو نے دن بھر ایک دوسرے سے بات نہیں کی تھی۔ اس کے بعد سے ترشی ہوئی باریک ابروؤں والا آدمی گھر پر تو نہیں آیا۔ مگر کلو ودیہ بلا ناغہ شام کو باہر چلی جاتی تھی۔

پھر یودوکیہ پر ایک اور آفت ٹوٹی۔ اس کی بے پرواہی ہی اس کی وجہ رہی ہوگی۔ مگر اس نے دیکھا کہ کاتیہ کے سمور کے گلو بند کو کیڑا لگ گیا کاتیا اس میں سے سمور کا کالر اور دستانے بنانا چاہتی تھی۔ اور اب تین جگہ سے نامراد کیڑے اسے چاٹ گئے۔ یودوکیہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ہولناک اطلاع بیٹی کو کس طرح دے۔

ماسکو، لینن گراڈ اور کیو کے مہاجرین اب واپس جا رہے تھے۔ ۱۹۴۳ء کے خزاں میں پروفیسر اور اس کی ترسی بیوی اور سالیاں بھی روانہ ہوگئیں۔ چارو نے چلتے وقت بے حد گرم جوشی سے یودوکیہ کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا۔ تینوں سنکی بڑھیاں آنکھوں میں آنسو بھر کر اس کی شکر گزار ہوئیں اور اسے پیار تک کیا۔ گھر واپس جانے کے خیال سے وہ کس قدر مسرور تھیں۔ یودوکیہ

نے یادگار کے طور پر پروفیسر کو ایک جوڑی اونی موزے بُن کر دیئے۔

۲۸

تھیٹر سے واپس آکر کلو ودیہ کرسی پر ٹکی اور میز پر اُلٹی لیٹ کر کاہلی سے بولی "میں جا رہی ہوں۔"

"کام سے بھیجا جا رہا ہے؟" یودوکم نے دریافت کیا۔

وہ کھڑی ہو گئی اور جسم کو اس طرح سیدھا کیا جیسے پر لگا کر اڑنے والی ہو۔ سگریٹ کیس نکال کر ایک سگریٹ رول کیا۔

"ہمیشہ کے لئے جا رہی ہوں، ماچس دینا یودوکم نکولائی وچ۔"

"ہمیشہ کے لئے؟" یودوکم نے لائٹر جلاتے ہوئے دُہرایا۔

پلیٹ اور تولیہ ہاتھ میں لئے ہوئے یودوکیہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ کلو ودیہ نے سگریٹ پھونکنا شروع کر دیا۔

"ہاں۔" پھر وہ زار زار رونے لگی۔

"میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ جذبات پر حکم نہیں چلایا جا سکتا۔ میں مسرت چاہتی ہوں۔ اس طرح کب تک رہے جاؤں۔ جوانی نکل جائے گی۔"

"فرض کر لیا کہ تم کسی اور کو پسند ہی کرنے لگی ہو۔ مگر یہ بھی تو یاد رکھو کہ پاویل ابھی ہسپتال میں ہے۔" یودوکم نے کہا۔

"کل تم ہی نے کہا تھا کہ وہ خطرے سے باہر ہے بہت سوں سے بہتر ہے۔"

"یہ بات اتنی آسان نہیں۔ ہرجائی پن سے خوشی نہیں ملتی۔ اس طرح اچانک چلے جانے سے کچھ نہیں بنے گا۔"

"مگر وہ اتنا دکھی ہے۔" کلو ودیہ نے سسکی بھر کر کہا "لیتھونیا سے آیا

ہے بے چارہ۔ سارا کنبہ نازسیوں نے مار ڈالا۔"

"لیکن یہاں سے جانے کی کیا جلدی ہے؟" یودوکم نے سوال کیا "کچھ مہینے اور ٹھہر کر پاویل کا انتظار کر لو۔ وہ آجائے تو اس کو ساری بات بتاؤ۔ کچھ فیصلہ کرو۔ ممکن ہے پاویل ہی تم کو سارے مردوں سے اچھا لگے۔"

کلوودیہ ہچکیاں لینے کے ساتھ ساتھ ہنس بھی رہی تھی۔

"تم کیسے آدمی ہو یودوکم نکولائی دوِچ، فیصلہ کیا کرنا چاہیے؟ پرانی محبت مر چکی۔ یہ آدمی اپنے وطن لوٹ رہا ہے اور میں اس کے ساتھ جا رہی ہوں۔"

"لیکن سنو تو کلوودیہ ——"

"ہم دونوں میاں بیوی بن چکے ہیں ——" کلوودیہ نے چیخ کر جواب دیا

یودوکم اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"اگر وہ استاد کھی ہے تو اسے اپنی بھنویں تراشنے کی کیا ضرورت ہے۔"

یودوکیہ نے دریافت کیا۔

"چپ رہو۔" کلوودیہ نے اور زیادہ چیخ کر کہا۔ "تم کچھ نہیں سمجھ سکتیں۔" اور تیزی سے اوپر چلی گئی۔ یودوکیہ کچھ دیر تک کھڑی سوچا کی۔ پھر بالا پوش اتار کر ہاتھ پونچھے اور اوور کوٹ پہننے لگی۔ اسی وقت یودوکم اندر آیا۔

"تم کہاں چلیں؟"

"نتالیہ سے ملنے فیکٹری جا رہی ہوں۔"

"کیوں؟"

"شاید وہ اس بلتی چھوکری کو نیک بد سمجھا سکے۔"

"تم گھر پر بیٹھو جی۔" یودوکم نے جواب۔ "نتالیہ اس گندگی میں ہاتھ نہیں ڈالے گی۔" چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے اضافہ کیا۔ "تم نے سن

لیا۔۔۔ یا نہیں کہ وہ اس کی بیوی بن چکی ہے۔"

ایک آہ بھر کر یودوکیہ نے اوورکوٹ اتار دیا۔ گھنٹہ بھر خاموشی طاری رہی۔ پھر یودوکیہ نے کہا۔

"میں اُسے بلاتی ہوں۔"

"کس لئے؟"

"بھوکی ہوگی، ایک نوالہ نہیں کھایا۔"

"اچھا۔ بُلا لو۔" یودوکم نے اداسی سے جواب دیا۔

یودوکیہ نے اوپر جاکر دروازہ کھولا۔ کلوودیہ پلنگ پر لیٹی کتاب پڑھ رہی تھی۔

"کلوودیہ، چلو کھانا کھالو۔"

"کلوودیہ نے کتاب نیچی کر کے ساس کو دیکھا۔ شدت گریہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔

"اماں، حالات جس طرح کے ہو گئے ہیں، اس کی وجہ سے میرا دل کٹتا ہے۔ بے چارہ پاویل۔ لیکن میں مجبور ہوں۔" اس نے بڑی سرخوشی اور بے خودی کے انداز میں کہا "میں محبت میں گرفتار ہو چکی ہوں۔"

۲۹

پاویل، کاتیہ اور ساشا کے خطوط ایک ٹین کے ڈبے میں محفوظ ہیں۔

جس میں پہلے مٹھائی کی گولیاں رکھی تھیں۔ یودوکم اور یودوکیہ کو ایک ایک خط زبانی یاد ہے۔ یہ ساشا کا خط ہے:۔

"اماں، ابا،

میں بے حد اداسی کے عالم میں تم کو لکھ رہا ہوں۔ بھلا ایک انسان جس کا مستقبل ہوا میں معلق ہو، کس طرح خوش رہ سکتا ہے۔ اور کتنی احمقانہ وجہ ہے کہ میں ایک یا دو سال کی دیر سے پیدا ہوا!— جنگ جلد ختم ہو جائے گی اور ہم لوگ ابھی تک اسکول ہی میں اٹکے ہوئے ہیں اور یہ دھمکی بھی دی گئی ہے کہ لڑائی میں حصہ نہ لے سکیں گے۔ بس پریڈ کے میدان اور کینٹین کے درمیان مارچ کرتے رہیں گے۔ میں نے اور میرے ایک دوست نے ایک اور درخواست بھیجی ہے کہ ہم نے عقب میں پڑے رہنے کے لئے خود کو والینٹر نہیں کیا تھا۔ اب تک کوئی جواب نہیں آیا۔ سو اب ہم نے ینگ کمیونسٹ لیگ کو لکھا ہے کہ شاید وہ لوگ زیادہ ہمدردی کا ثبوت دیں۔ تم کو نتیجے سے مطلع کروں گا۔

تمہارا پیارا بیٹا

الگزینڈر چیرنیشوف"

کاتیہ نے لکھا تھا:—

اماں، ابا،

تمہارے خط نے مجھے بے حد فکرمند کر دیا۔ مجھے پاویل کی خاطر بہت افسوس ہے۔ رہی ودیہ تو خس کم جہاں پاک۔ جہنم میں جائے چولہے بھاڑ میں جائے۔ اگر میں پاویل کی جگہ ہوتی تو ذرا سا بھی رنج نہ کرتی۔ لیکن مجھے پتہ ہے وہ اپنی جان کو روگ لگائے گا۔ وہ اس پر بُری طرح عاشق ہے۔ اماں، ابا مجھے ضرور لکھنا کہ پاویل اس صدمے کو کس طرح برداشت کر رہا ہے۔ اماں، میرا سفید

فراک نینا کلسٹر تو ونا کے پاس لے جاؤ۔ وہ والا جو پیچھے سے پھٹ گیا ہے اور نینا سے کہو کہ اس میں سے میرے لئے ایک بلاؤز بنا دے۔ جتنا فیشن ایبل ہو سکے اتنا، ایک دم فرسٹ کلاس مجھے یہی نہیں معلوم کہ آج کل تازہ ترین فیشن کیا ہے۔
ہم دُم دبا کر بھاگتے ہوئے نا تسیوں کا پیچھا کر رہے ہیں۔ یہ سب خبریں تو تم کو معلوم ہی ہوں گی۔ اماں، نینا سے کہو کہ بلاؤز جلدی تیار کر دے۔ تم سب کو پیار۔ اماں، ابا، نتالیہ، و ولو دیا لینا ـــ اور میری سب سہیلیوں کو میرا اسلام پہنچا دینا۔ اور خط جلدی جلدی اور برابر لکھتے رہو۔

منتظر جواب

تمہاری کاتیہ"

مزید:۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے ودیہ سے کچھ نہیں کہا ہو گا۔ بڑا افسوس ہے۔ میں ہوتی تو اچھی طرح اس کی خبر لیتی۔ بیگم صاحبہ کے حواس ٹھکانے آجاتے۔ اس کی اصلیت اس پر واضح کر دیتی چڑیل کہیں کی۔
اور پاویل نے لکھا تھا:۔

میرے پیارو،

تمہارے پیارے پیارے خطوں کا شکریہ۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں اور ڈیوٹی پر واپس جا رہا ہوں۔ نیا پتہ بعد میں لکھوں گا۔ میں بالکل تندرست ہوں۔ فکر مت کرنا! تم سب کو

پیار۔

پاویل

ودیہ کا کوئی ذکر نہیں، جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔

۳۰

ہفتے کی شام کو نتالیہ فیکٹری سے آتی ہے۔ تیوری پر بل ڈالے ہونٹ بچکائے۔ وہ حمام گرم کر کے بچوں کو نہلاتی ہے، خاموشی سے اور بڑی پھرتی کے ساتھ، پھر خود نہاتی ہے اور اس کے بعد بشاش اور تازہ دم، تمتماتے رخساروں کے ساتھ، خوب صورت ڈریسنگ گاؤن پہنے، باہر آتی ہے۔

بچے ننگے پاؤں اسٹوو کوچ پر بیٹھے ٹانگیں ہلا رہے ہیں۔ نتالیہ ان کو بستر پر سلاتی ہے، پتلا زینہ طے کر کے پاویل کے کمرے میں جاتی ہے۔ ودیہ کے جانے کے بعد سے یہ کمرہ سونا پڑا ہے۔ پاویل کی بنائی ہوئی ایک تصویر دیوار پر آویزاں ہے۔ اس کے نیچے لکھا ہے "پیاری ودیہ کے لئے۔ ۱۸ مارچ ۱۹۴۰ء کے یادگار موقع پر۔" اس تحریر کے علاوہ کوئی چیز ودیہ کی نشانی نہیں۔ وہ سب کچھ سمیٹ بٹور کر ساتھ لے گئی دھاگے کی خالی ریلیں تک۔ لیکن پاویل کے اس تحفے کے لئے اس کے بکس میں شاید جگہ نہیں تھی۔

نتالیہ میز پر بیٹھ کر اپنے شوہر اور اپنے بھائی کو خط لکھتی ہے ودیہ کے جانے کے بعد سے وہ پاویل کو ہر ہفتے خط لکھتی ہے۔ جس میں وہ

اپنی تکان کا، یا ودیہ کا، یا زندگی کی مصیبتوں کا بالکل تذکرہ نہیں کرتی بلکہ اپنے بچوں، والدین، کارخانے کے کام، جنگ کے متوقع خاتمے کے متعلق لکھتی رہتی ہے ۔ جنگ کا خاتمہ ـــ جب یہ فراق اور جدائیاں اور بدنصیبیاں بھی ختم ہو جائیں گی۔

اتوار کی صبح کو لیودوکیہ ہاٹ جاتی ہے جہاں سؤر کے گوشت اور ساسیج کے ڈبے بیچنے والوں، روندھی آوازوں والی گوالنوں اور جھگڑالو مٹھائی فروشوں، فتح اور وفادار بیویوں اور بہادر فوجی شوہروں کی مدح میں گیت الاپنے والے گویّوں اور نجومیوں کے جم غفیر میں گھس کر سودا سلف خریدتی ہے ۔ وہ بھی نابینا، چالباز جوتشیوں کے تاش کے پتوں، موتیوں اور پُراسرار کتابوں کے ذریعے اپنی قسمت کا حال معلوم کرنا چاہتی ہے ۔ مگر ایسا کرتے وقت جھینپتی ہے ۔ اگر اس کے کسی شناسا نے اسے دیکھ لیا تو کہیں گے۔ "لیودوکم نکولائی ویچ کی بیوی، نتالیہ کی ماں ضرور ایک دقیانوسی اور جاہل عورت ہے" اور لیودوکم اور نتالیہ بھی اس حرکت کو ناپسند کریں گے ۔ سو وہ نجومیوں کی طرف سے پلٹ آتی ہے ۔ اور نجومیوں کے گرد جمع عورتوں کی بھیڑ کی نظریں بچاتی ۔ دوسری طرف چلی جاتی ہے، کہ کہیں اگر اس مجمع میں کوئی اس کا شناسا عورت ہو تو اس غریب کو بھی جھینپنا نہ پڑے ۔

وہ گھر لوٹتی ہے ۔ چولہا گرم کر دیا گیا ہے اور کنبے کے پانچوں افراد ناشتے کی میز کے گرد بیٹھ جاتے ہیں ۔ لیودوکم، لیودوکیہ، نتالیہ اور دونوں بچے، یہ ناشتے کا وقت ان زمانوں سے مختلف ہے جب اسی میز کے گرد اتنے سارے لوگ ہوتے تھے ۔ گھر خالی خالی سا معلوم ہو رہا ہے مگر دریچوں پر سفید براق پردے پڑے ہیں اور کاتیہ کے پھول خوب کھل رہے ہیں ۔ ہر چیز اپنی اپنی

جگہ اس سلیقے اور قرینے سے موجود ہے جیسے کاتیہ، پاویل اور ساشا ابھی ابھی باہر گئے ہوں۔ اور جلد ہی واپس آنے والے ہوں۔ یودوکم اپنی اتوار کی بہترین پوشاک پہنے اپنی معمول کی جگہ پر بیٹھا ہے۔ اور یودوکم اپنی پرانی متانت کے ساتھ چولہے اور میز کے درمیان پھیرے لگا رہی ہے ہمیشہ کی طرح اس کی کنجی آنکھوں میں ہوشیاری کی جھلک تیر رہی ہے۔ اور ہلکا سا تبسم اس کے ہونٹوں پر رقصاں ہے لیکن ان نگاہوں اور اس تبسم میں ایک نئی روشنی ہے۔ ماتا اور صبر و ضبط کی روشنی۔ سرو قد اور دلکش، نفاست سے بال بنائے، جن میں چاندی کے تار جگمگا رہے ہیں۔ نتالیہ بھی اپنی کرسی پر بیٹھی ایک آدھ بار بچوں کو دیکھ لیتی ہے کہ وہ اپنے چمچے سلیقے سے استعمال کر رہے ہیں یا نہیں۔ اپنی جگہ پر بے کلی اور چلبلے پن سے تو نہیں بیٹھے اور کرسیوں سے اچھل تو نہیں رہے ہیں۔

"تم تو ان کو قواعد پریڈ کراتی ہو جیسے سپاہی ہوں بے چارے۔" یودوکیہ کہتی ہے۔ "اگر بچوں نے اب شرارت نہ کی تو کب کریں گے؟"

"لیکن یہ سپاہی ہی تو ہیں۔" نتالیہ جواب دیتی۔ "آج ہم سب سپاہی ہیں۔"

اس پر ودلودیہ کرسی کے نیچے اپنے پیر جوڑ لیتا ہے اور اس کا چہرہ سخت ہو جاتا ہے۔

"کاتیہ کے خط کی آخری تاریخ یاد ہے یودوکیہ؟" یودوکم دریافت کرتا ہے۔ "سولہ۱۶ تھی یا سترہ۱۷؟"

یودوکم کو اچھی طرح علم ہے کہ سولہ۱۶ تاریخ تھی۔ لیکن یہ ٹین کے ڈبے میں سے خط نکال کر بارہویں دفعہ پڑھنے کا بہانہ ہے۔ دور خلاؤں میں دیکھتے

ہوئے ۔ جہاں، دور دراز کے میدانِ جنگ میں اس کی سپاہی بیٹی لڑنے میں مصروف ہے، یودوکیہ خط سنتی رہے گی۔ سخت گیر نتالیہ بھی مہر و محبت کی نرمی کے ساتھ اپنی بہن کے متعلق سوچنے لگے گی اور وولودیا خاموش ہو کر چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ محاذِ جنگ، بکتر گاڑیوں، اور اپنی پُر اسرار خالہ کاتیہ کا تصور کرے گا۔ خالہ اس وقت کیا کر رہی ہوں گی؟

"ڈاک آگئی ـــــ" دریچے میں سے لینا چلاتی ہے۔

"خدا رحم کرے ۔ اپنی امان میں رکھے ـــ" یودوکیہ چپکے سے کہتی ہے۔ اور سب بھاگ کر گیلری میں جاتے ہیں۔

چیچک رو، چوڑی چکلی ڈاکیہ لڑکی اپنے تھیلے میں پڑے خطوں کو اُلٹ پلٹ کرنے کے بعد دو خط برآمد کرتی ہے۔

"کاتیہ اور نکولائی ـــــ" یودوکم کہتا ہے۔

"ابّا اور خالہ کے خط ـــ" وولودیہ اور لینا خوف زدہ مسرت کے ساتھ چلاتے ہیں۔

"اندر آکر کچھ گرم گرم کھالو۔" یودوکیہ ڈاکیہ لڑکی سے کہتی ہے۔ "بارش میں شرابور ہو۔"

"وقت نہیں ہے۔" لڑکی جواب دیتی ہے تسمے کے ٹکڑوں سے بندھے ہوئے بھدّے مردانہ جوتے پہنے کھٹ کھٹ کرتی وہ آگے بڑھ جاتی ہے۔ موسم کیسا بھی ہو، آندھی ہو، بارش یا برفباری، یہ لڑکی کیروف اسٹریٹ پر اسی طرح اپنے چکر لگانے میں مصروف رہتی ہے۔ اس کا تھیلا محاذ سے آئے ہوئے خطوط سے لبریز ہے، اور وہ گھروں کے دریچوں پر تقدیر کی مانند دستک دیتی ہے۔

21

ہماری مطبوعات

کارِ جہاں دراز ہے (حصہ اول)	قرۃ العین حیدر
〃 〃 〃 (حصہ دوم)	〃 〃
آگ کا دریا	〃 〃
فصلِ گل آئی یا اجل آئی	〃 〃
پطرس کے مضامین	پطرس بخاری
پطرس کے خطوط	〃 〃
زیرِ لب	صفیہ اختر
حرفِ آشنا	〃 〃
گنجے فرشتے	منٹو
انارکلی	〃
ٹھنڈا گوشت	〃
کرنیں	شفیق الرحمٰن
دو ہاتھ	عصمت چغتائی
رات چور اور چاند	بلونت سنگھ
تعمیرِ حیات	ڈیل کارنیگی
زرد پتے	خلیل جبران
پاگل	خلیل جبران
محبت اور جوانی	〃 〃
ایک گدھے کی سرگزشت	کرشن چندر
پھول کی تنہائی	〃 〃
الٹا درخت	〃 〃
محبت کی رات	〃 〃
مضامین کرشن چندر	〃 〃
لذیذ پکوان	شائستہ کوثر
نقوشِ زنداں	سجاد ظہیر
کلیاتِ جگر	جگر مراد آبادی
آتشِ گل	〃 〃
کلیاتِ شکیل	شکیل بدایونی
کلیاتِ ساحر	ساحر لدھیانوی
تلخیاں	
گلِ نغمہ	فرا

مکتبۂ اردو ادب لاہور